احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

مئی 2026ء

تہذیبی غلامی اور زوالِ ادب

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی و تربیتی خصوصی خطاب

سفرِ حج اور فلسفۂ قربانی

انا کی نفی سے بقا کی منزل تک

حضور پیر سیدنا طاہر علاؤ الدین الگیلانی البغدادیؒ

شریعت، طریقت اور حقیقت کا سنگم

مقصدِ حیات

رضائے الٰہی کی تلاش

فنِ مطالعہ

ایک علمی و فکری راہنمائی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا دورۂ پرتگال

منہاج القرآن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام فاؤنڈنگ ممبرز ڈے کے موقع پر پروقار تقریب کا انعقاد

احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

جلد: 40
شمارہ: 05
ذوالقعدہ / ذوالحج ۱۴۴۷ھ / مئی 2026ء

بفیضانِ نظر
قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز

زیرِ سرپرستی
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر حسن محی الدین قادری | ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

چیف ایڈیٹر: نوراللہ صدیقی

ایڈیٹر: محمد یوسف

ایڈیٹوریل بورڈ
ڈاکٹر محمد رفیق نجم، ڈاکٹر محمد فاروق رانا، عین الحق بغدادی
محمد بلال اُپل، سید علی عباس بخاری، فیصل حسین مشہدی، حفیظ اللہ جاوید

مجلس مشاورت
خرم نواز گنڈا پور، احمد نواز انجم، جی ایم ملک
محمد جواد حامد، سرفراز احمد خان، منظور حسین قادری
غلام مرتضیٰ علوی، علی عمران، داؤد حسین مشہدی

قلمی معاونین
مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی، محمد شفقت اللہ قادری
ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، ڈاکٹر محمد افضل قادری

حسن ترتیب

اداریہ: غربت وافلاس ہماری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے	(چیف ایڈیٹر)	5
القرآن: تہذیبی غلام اور زوالِ ادب	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	8
الفقہ: حج وقربانی کی فضیلت	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی	24
سفرِ حج اور فلسفۂ قربانی	پروفیسر منظور الحسن	30
مقصدِ حیات: رضائے الٰہی کی تلاش	شیخ حماد مصطفیٰ المدنی القادری	40
حضور پیر صاحبؒ: شریعت، طریقت اور حقیقت کا سنگم	محمد یوسف منہاجین	50
فنِ مطالعہ: ایک علمی وفکری راہنمائی	ڈاکٹر نعیم مشتاق	60
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا دورۂ پرتگال	خصوصی رپورٹ	70
MQI فاؤنڈنگ ممبرز ڈے۔ تقریب کا انعقاد	خصوصی رپورٹ	75
یونیسکو چیئر: منہاجینز کے زیرِ اہتمام تقریبِ تحسین کا انعقاد	خصوصی رپورٹ	80
عرس حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فریدالدین قادریؒ	خصوصی رپورٹ	85

ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

www.minhaj.info
www.facebook/minhajulquran
email:mqmujallah@gmail.com (مجلّہ آفس وسالانہ خریداران)
minhaj.membership@gmail.com (نظامت ممبر شپ/ رفقاء)
smdfa@minhaj.org (بیرون ملک رفقاء)

کمپیوٹر آپریٹر: محمد اشفاق انجم — ترسیل انچارج: حافظ ظہیر احمد
خطاطی: محمد اکرم قادری — گرافکس: ساجد علی یوسف

قیمت فی شمارہ: 60 روپے
سالانہ خریداری: 700 روپے

انتباہ! مجلّہ منہاج القرآن میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کئے جاتے ہیں ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدل اشتراک: مشرق وسطیٰ جنوب مشرقی ایشیاء، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، مشرق بعید جنوبی امریکہ وریاستہائے متحدہ امریکہ 30 امریکی ڈالر سالانہ

ترسیل زر کا پتہ: اکاؤنٹ نمبر 02930103644000 میزان بینک شالیمار لنک روڈ لاہور پاکستان

ناشر: محمد اشرف قادری، مطبع: منہاج القرآن پرنٹرز 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور UAN:042-111-140-140 Ext: 128

حمدِ باری تعالیٰ

سب نام اچھے جتنے ہیں ذاتِ خدا کے ہیں
اوصاف سب حمیدہ اُسی کبریا کے ہیں
"انعام پانے والوں کی دِکھلا دے رہ ہمیں"
سکھلائے اس نے حرف یہ ہم کو دعا کے ہیں

الحمد سے والناس تک اس کا کلام ہے
اس کا کلام ہی تو ملوک الکلام ہے
باقی ہے زندہ تا ابد وہ ذاتِ لایزال
سب کچھ فنا ہے بس اُسے حاصل دوام ہے

حیّ و قیّوم ذات اُسی کی قدیم ہے
وہ خالقِ جہاں ہی خبیر و علیم ہے
اس کی نوازشات کا ہے سلسلہ دراز
ذات اس کی سب کریموں سے بڑھ کر کریم ہے

سرچشمہ ہدایتِ ازلی ہے اس کی ذات
ہر جادہ کی منزل ہے وہ، منزل نما ہے وہ
اس کا پتا نہ مل سکے عقل و شعور سے
ادراک کی حدوں سے وراء الوراء ہے وہ

اللہ آسمانوں زمینوں کا نور ہے
کوئی بشر نہ اس کی حقیقت کو پاسکے
وسعت کہاں آفاق کی پہنائیوں میں ہے
مومن کا دل ہی ہے کہ وہ جس میں سما سکے

﴿ضیا نیّر﴾

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

پھوٹا جو لامکاں سے ہے وہ سیلِ نور آپؐ
قرآں کے حرف حرف میں ہیں مثلِ طور آپؐ

مانگے بغیر آپؐ کی چوکھٹ سے مل گیا
آگاہِ غیب، محرمِ ما فی الصدور آپؐ

مَیں کتنا گنہ گار سیہ کار امتی
لیکن مرے رحیم و رؤف و غفور آپؐ

مَیں وہ کہ تیرگی کی تہوں میں دبا ہوا
روزِ ازل سے عرش پہ تحریر نور آپؐ

مَیں وہ کہ ہر قدم پہ ہے لغزش لکھی ہوئی
لیکن معاف کرتے ہیں سارے قصور آپؐ

برباد کر گیا تھا جو طوفانِ رنگ و بو
آباد پھر سے کر گئے مجھ کو حضور آپؐ

در پر بلا کے میری طرح کے حقیر کو
کرتے رہے عطا و کرم کا وفور آپؐ

نگہِ کرم سے آپؐ کی زندہ ہوا ہوں مَیں
اب اپنے در پہ موت بھی دے دیں حضور آپؐ

رکھتا ہوں پاک دل کو بتان ہوا سے مَیں
رہنے لگیں گے اس میں یقیناً، ضرور آپؐ

غم ہے مجھے کوئی تو رضائے نبیؐ کا ہے
رکھتے ہیں سب غموں کو مگر مجھ سے دور آپؐ

﴿شیخ عبدالعزیز دباغ﴾

غربت و افلاس
ہماری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے

ہمارا اس بات پر یقین ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ قرآن و سنت کے بیشتر مضامین انسانی زندگی کو متوازن بنائے رکھنے سے متعلق ہے۔ اسلام ایک ایسا الوہی نظام عطا کرتا ہے جو انسانیت کو ہر شعبہ زندگی میں رہنمائی عطا کرتا ہے۔ رہنمائی کا یہ سلسلہ عبادت و ریاضت، حلال و حرام تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک انسان کو اس کے روزانہ کے معمولات، سونا، جاگنا، کھانا، عبادت، ریاضت الغرض تمام امور پر راہنمائی مہیا کی گئی ہے مگر افسوس بحیثیت مسلمان ہم ان الوہی ہدایات و تعلیمات کو فراموش کر چکے ہیں۔ وقت کا ضیاع ہو، خوراک کا ضیاع ہو، اللہ کی اطاعت کردہ نعمتوں کی حفاظت میں غفلت ہو یا اس کے انعام و اکرام کا ضیاع ہو، ہر معاملے میں ہم آنکھیں بند کر کے چل رہے ہیں اور نتیجتاً بیماری، غربت اور افلاس ہم پر مسلط ہے۔ یہ غربت ہماری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے۔ آیئے ذیل میں کچھ ایسے اعداد و شمار پڑھتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج بھی اللہ رب العزت کی عطا میں کوئی کمی نہیں ہے مگر حفاظت کے معاملے میں ہم مجرمانہ رویوں سے دوچار ہیں۔

خوراک کی پیداوار میں مسلسل کمی اور خوراک کا ضیاع یہ دونوں المیے بیک وقت پاکستان میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو خدانخواستہ ایشیا کی فوڈ باسکٹ پاکستان میں ہمیں وہ تمام تکلیف دہ مناظر دیکھنے کو مل سکتے ہیں جو ہم افریقی ممالک میں دیکھتے ہیں۔ جہاں تک خوراک کی پیداوار میں کمی کا سوال ہے تو ہم پچھلی کئی دہائیوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ناگہانی آفات، سیلاب، بارشوں، موسمی تغیرات اور پانی کی کم یابی کی وجہ سے زرعی سرگرمیاں سکڑ رہی ہیں۔ پنجاب اور خیبر پختونخوا میں صورت حال ناگفتنی ہے۔ ہر سال پنجاب میں سیلاب آتے ہیں جس

کا سب سے زیادہ نشانہ رورل ایریا بنتا ہے۔ 2025ء میں آنے والے سیلاب سے ہزاروں ایکڑ زرخیز رقبہ کھڑی فصلوں سمیت تباہ ہوا اور اس تباہی کے سبب سے 33 لاکھ افراد ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہزاروں، لاکھوں کسان اور مزارع فصلوں کی تباہی کی وجہ سے ایک مقروض کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ انفراسٹرکچر کی تباہی اس کے علاوہ ہے۔ روزنامہ ڈان کی ایک رپورٹ کے مطابق موسمیاتی تبدیلیوں اور سیلابوں کے باعث 78 فیصد نقصان دیہی علاقوں میں ہوا۔ یہ دیہی علاقے درحقیقت زراعت کا مرکز ہیں۔ جب یہاں سرگرمیاں سکڑتی ہیں تو اس کے اثرات پورے پاکستان پر مرتب ہوتے ہیں۔ سیلاب کی تباہیوں سے بچنے کے اسباب کیا ہیں؟ آج ہمارا یہ موضوع نہیں ہے چونکہ اس پر بہت لکھا جا چکا، اگر ہم نے چھوٹے، بڑے مطلوبہ تعداد کے ڈیمز تعمیر کیے ہوتے تو یہی پانی جو ہمیں فصلوں سمیت ڈبو دیتا ہے، یہ ہمارے لئے سونا بن جاتا۔

اب دوسرا سب سے بڑا سوال خوراک کے ضیاع کا ہے، جی ہاں ہم ایک ایسی قوم ہیں جو خوراک کو ضائع کرنے میں بہت سخی ہیں، اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام 2024ء کے حوالے سے جاری شدہ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان آبادی کے لحاظ سے پانچواں بڑا ملک ہے اور خوراک کے مجموعی ضیاع کے حوالے سے چوتھے نمبر پر ہے۔ کبھی کبھی ہم خوراک ضائع کرنے والی دوسری قوم کا بھی ٹائٹل اپنے نام کر لیتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق دنیا بھر میں سالانہ 1.3 بلین ٹن خوراک ضائع ہو جاتی ہے جو کہ خوراک کی عالمی پیداوار کا تقریباً ایک تہائی ہے۔ اس ضمن میں غریب اور ترقی پذیر ملک پاکستان کافی کس سالانہ بنیادوں پر خوراک کے ضیاع کے حوالے سے پوری دنیا میں دوسرے نمبر پر ہونا باعث تشویش ہے۔ ایک طرف پاکستان میں 60 ملین سے زائد پاکستانی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور دوسری طرف خوراک ضائع کرنے والے ملکوں کی فہرست میں ہم دوسرے نمبر پر ہیں، شاید اس طرف ہمارے پالیسی سازوں کا کبھی دھیان نہیں گیا۔ اگر اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے اس قسم کی رپورٹس جاری نہ کریں تو ہمیں احساس تک نہ ہو کہ ہم کس شعبے میں کس گراوٹ کا شکار ہیں۔

یہاں اس امر پر بھی شکوہ بنتا ہے کہ 57 اسلامی ممالک کے دوارب سے زائد انسانوں کی ضروریات ،اُن کے مسائل کی درست تشخیص کے لئے ہمارے پاس اعداد و شمار یا سروے کا کوئی مستند نظام موجود نہیں ہے۔ اس معاملے میں ہم غیر ملکی عالمی سروے اداروں کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مرہون منت ہیں۔ ہم بات کر رہے ہیں پاکستان کی بھوک کے عالمی انڈکس میں انتہائی 123 غریب ممالک کی فہرست میں پاکستان کا نمبر 106 ہے جو ایک سنجیدہ اور غور طلب مسئلہ ہے۔ ایک ایسا ملک جسے اللہ نے سرسبز میدانوں، پہاڑوں، دنیا کے بڑے نہری نظام سے نواز رکھا ہے اس ملک کی غربت کا یہ عالم ہے کہ وہاں

6 کروڑ سے زائد لوگ خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر دیانتداری کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو کم و بیش 10 کروڑ سے زائد افراد غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اگر حالیہ پٹرول کی قیمتوں اور ہوشربا یوٹیلٹی بلوں کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تعداد اس سے بھی بڑھ جاتی ہے چونکہ غریب عوام کو اُن کی مجموعی آمدن سے زائد یوٹیلٹی بلز موصول ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں ہر سال 36 ملین ٹن خوراک ضائع ہو جاتی ہے یعنی ہر شخص 122 کلو گرام خوراک ضائع کرتا ہے اگر 36 ملین ٹن خوراک کے ضیاع کا روپوں میں اندازہ لگایا جائے تو یہ 4 ارب ڈالر سے زائد کی رقم بنتی ہے۔ اس کے برعکس ہمسایہ ملک بھارت میں خوراک کے ضیاع کی سالانہ فی کس شرح 54 کلو گرام ہے۔

خوراک کے ضیاع میں بہت سارے عوامل کارفرما ہیں، جن میں ناقص انفراسٹرکچر، ٹیکنالوجی کا فقدان، فوڈ سٹوریج کی سہولیات میں کمی، نقل و حمل اور سپلائی چین اور اس حوالے سے کسانوں کی تربیت اور خوراک کی ٹرانسپورٹیشن میں بروئے کار آنے والی افرادی قوت کی ناتجربہ کاری سرفہرست ہے۔ یہاں خوراک کے ضیاع کی ایک اور نشاندہی بے محل نہ ہو گی، ہم شادی بیاہ اور دعوتوں میں خوراک کی بے حرمتی اور ضیاع کے جو مناظر دیکھتے ہیں وہ بھی اس ضیاع میں شامل ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم خوراک کے ضیاع کے اعداد و شمار کو کم سے کم سطح پر کیسے لائیں؟ سورہ عبس میں اللہ رب العزت نے فرمایا: ''پس انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کی طرف دیکھے'' اس آیت مبارکہ کی تفسیر حدیث مبارک میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر 7 آنتوں میں کھاتا ہے یعنی مومن صرف اتنا کھاتا ہے جس سے وہ جسم اور جان کا رشتہ برقرار رکھ سکے اور کافر اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ کتنا کھا رہا ہے۔ یہ تعلیم ہے کہ پیٹ بھر کر مت کھاؤ، پیٹ بھر کر کھانا بھی خوراک کا ضیاع بھی ہے اور صحت کا نقصان بھی ہے۔ ایک اور حدیث مبارک میں آپ ﷺ نے فرمایا: انسان نے پیٹ سے زیادہ برا برتن نہیں بھرا۔ انسان کے لئے چند لقمے کھانا کافی ہے جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھ سکیں۔ اگر زیادہ کھانا ضروری ہو تو پیٹ کا ایک تہائی کھانے کے لئے، ایک پانی کے لئے اور ایک تہائی سانس لینے کے لئے رکھے۔ آپ ﷺ نے ایک بڑی توند والے فربہ شخص کو دیکھا اور اپنے دست مبارک سے اس کے بڑے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اگر یہ اس کے علاوہ کسی دوسری جگہ ہوتا تو تیرے لیے بہتر ہوتا یعنی آپ ﷺ کا اشارہ اس طرف تھا کہ اس شخص نے اگر اپنے کھانے میں سے کسی اور شریک کیا ہوتا تو اس کی توند کی حالت یہ نہ ہوتی۔

بحیثیت مسلمان ہمارے سامنے ہمارے پیارے نبی حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ بطور ماڈل موجود ہے۔ اس سے استفادہ کرنے سے ہم اس المیہ سے باہر نکل سکتے ہیں۔

تہذیبی غلامی اور زوالِ ادب

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی و تربیتی خصوصی خطاب

ترتیب و تدوین: محمد یوسف منہاجین

گزشتہ سے پیوستہ

موجودہ دور میں ہمارا تصورِ دین ادب سے خالی ہو چکا ہے۔ YouTube اور سوشل میڈیا نے اخلاقی اقدار، آداب اور اعلیٰ روایات کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم پر میڈیا کا اثر بہت زیادہ غالب آ چکا ہے؛ ہمارے بچوں کی زبان، لب و لہجہ اور طرزِ گفتگو سب بدل گیا ہے۔ انہوں نے ایک من گھڑت اور جعلی لہجہ اپنا لیا ہے، جو غالباً فلموں اور ڈراموں کی ذہنی و فکری غلامی کا نتیجہ ہے۔

بد قسمتی سے اس ملک میں ثقافتی اور لسانی غلامی جڑ پکڑ چکی ہے۔ آج ٹی وی چینلز پر جو اردو بولی جا رہی ہے، ایسی زبان ہم نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ یہ اردو ادب کی زبان نہیں بلکہ بد تمیزی اور اکھڑ پن کی زبان ہے۔ اس سے نہ صرف Literature (ادب) کا حسن ختم ہوا بلکہ انسانی رشتوں کا احترام بھی پامال ہو گیا۔ بچے سارا دن ڈراموں، Talk Shows اور Morning Shows سے زبان، لباس اور Culture سیکھ رہے ہیں۔ مجھے وہ الفاظ دہراتے ہوئے شرم آتی ہے جو آج کل بچے آپس میں یا والدین کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بچیاں ایک دوسرے کو "یار" کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ پہلے زمانے میں اگر یہ لفظ سنا جاتا تو ہم ڈوب مرتے؛ "یار" کے لفظ میں جو ضرورت سے زیادہ Frankness (بے تکلفی) اور بے ہودگی ہے، وہ حیا کے پردے چاک کر دیتی ہے۔ جب گفتگو سے حیا اور کلام سے ادب نکل جائے، تو پھر اخلاق کہاں باقی رہتا ہے؟ آج کل تو بات ہی گالی سے شروع کی جاتی ہے۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ ادب کی یہ کمی صرف عام لوگوں تک محدود نہیں رہی، بلکہ دین کی دعوت دینے والوں کی زندگیوں سے بھی ادب رخصت ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو حکم دیا تھا کہ حکمت اور نرم دلی سے بات کرو، اور اگر کسی مخالف سے بحث کرنی پڑے تو احسن (بہترین) طریقے سے کرو مگر آج جب سوشل میڈیا پر کسی دوسرے کے نقطہ نظر یا عقیدے کو رد کیا جاتا ہے، تو اس کی ایسی تیسی کر دی جاتی ہے۔ اسے غلیظ گالیاں دی جاتی ہیں، فتویٰ بازی ہوتی ہے اور سرِ عام تذلیل کی جاتی ہے۔

جب لاکھوں کی تعداد میں نوجوان نسل کسی نام نہاد عالم، امام یا خطیب کی زبان سے یہ لب و لہجہ سنے گی، تو ان کی اپنی زندگیوں میں ادب کہاں سے آئے گا؟

مغرب کی اندھی تقلید اور ہمارا دوہرا معیار

ایک طرف بھارتی ثقافت کا حملہ ہے اور دوسری طرف پورے Western World (مغربی دنیا) کے کلچر کا اثر ہمیں گھیرے ہوئے ہے، جس میں ادب کا وہ مخصوص تصور سرے سے موجود ہی نہیں جو ہمارے دین کا خاصہ ہے۔ مغربی معاشرے نے اپنے بچوں کو کچھ سیکولر انسانی اقدار (Secular Human Values) ضرور دی ہیں؛ مثلاً وہاں اسکولوں میں بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ جھوٹ نہیں بولنا، دھوکہ دہی، مکاری اور چوری سے بچنا ہے، دیانت داری اختیار کرنی ہے۔ وہ ان معاملات میں بہت سخت ہیں، مگر چونکہ ان کے ہاں ایمان، حلال و حرام اور بڑوں کے ادب کا مذہبی تصور موجود نہیں، اس لیے وہاں کے بچے اکثر بدتمیز اور گستاخ ہو جاتے ہیں اور والدین کی بات نہیں سنتے۔ وہ اسے اپنی آزادی سمجھتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم مغرب سے ان کی اچھی عادات (جیسے سچائی اور وقت کی پابندی) تو نہیں لیتے، مگر ان کی بے راہ روی اور بے ادبی کو فوراً اپنا لیتے ہیں۔

اگر ہمیں باہر کی دنیا، مغرب، یورپ یا امریکہ کی پیروی اور ذہنی غلامی ہی کرنی ہے، تو چاہیے کہ ان کی اچھی باتوں کی بھی پیروی کریں۔ وہ لوگ جھوٹ نہیں بولتے، جب کہ ہمارے بچے جھوٹ بولتے ہیں۔۔۔ وہ دھوکہ دہی نہیں کرتے، ہم کرتے ہیں۔۔۔ وہ چوری نہیں کرتے، ہم کرتے ہیں۔۔۔ وہ کسی کی پیٹھ پیچھے غیبت کا ایک جملہ تک نہیں بولتے، جب کہ ہم غیبت اور چغلی میں ملوث ہیں۔ جبکہ دوسری طرف وہ Rude (بدتمیز/اکھڑ) ہیں، تو ہم بھی Rude طریقے سے بات کرنا سیکھ لیتے ہیں۔۔۔ وہ "آزادی" کی بات کرتے ہیں، تو ہم بھی ایسی مکمل آزادی چاہتے ہیں جو ہمارے دین میں نہیں ہے۔ ہم ان کی تمام بداخلاقیاں اور گناہ تو اپنا لیتے ہیں، مگر ان کی اچھائیاں نہیں لیتے۔

عجب پیمانہ ہے کہ ہر وہ برائی جس سے اللہ، اس کے رسول ﷺ اور دین نے منع کیا، وہ ہم مغرب سے لے لیتے ہیں، لیکن ہر وہ اچھائی جو Western World کے تعلیمی اداروں اور کلچر میں ہے، اسے قبول نہیں کرتے۔ یہ وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر ہمارا معاشرہ اور ہماری نسلیں تباہ ہو رہی ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا ادب اور اس کا اجر

اس مضمون کے گزشتہ حصہ (ماہ اپریل 2026ء) میں ہم بارگاہِ الوہیت کے آداب کا مطالعہ کر چکے ہیں، آیئے! اب ہم انبیاء کرام علیہم السلام کے ادب اور اس کے اجر کے بیان کی طرف بڑھتے ہیں:

(۱) فرعون کے جادو گر: ادب کا صلہ اور قبولِ ایمان

ادب کے اجر کی ایک عظیم مثال قرآنِ مجید نے فرعون کے جادو گروں کے واقعہ میں بیان فرمائی ہے۔ جب فرعون نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے پورے مصر کے بڑے بڑے جادو گروں کو جمع کیا۔ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ان جادو گروں نے، جو اس وقت کافر تھے، موسیٰ علیہ السلام کی بزرگی کا ایک لطیف احساس کرتے ہوئے ان سے اجازت مانگی۔ قرآنِ مجید کی سورۃ الاعراف کی آیات: 115 تا 120 میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ انہوں نے کہا:

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ۔

”ان جادو گروں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو (اپنی چیز) آپ ڈال دیں یا ہم ہی (پہلے) ڈالنے والے ہو جائیں۔“

انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو پہلے موقع دے کر ان کا ادب کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "تم ہی پہلے ڈالو"۔ جب انہوں نے اپنی رسیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن گئیں، مگر جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ ان سب کے جعلی سانپوں کو نگل گیا۔ فرعون اور اس کے وزراء یہ سب دیکھ رہے تھے مگر کسی کو ایمان کی توفیق نہ ہوئی، لیکن جادو گروں نے چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا ادب کیا تھا اور ان سے اجازت مانگی تھی، اللہ نے اس ادب کا صلہ یہ دیا کہ انہیں فوراً سجدے کی توفیق عطا فرما دی۔ قرآن کہتا ہے:

وَ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجِدِیْنَ۔ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

”اور (تمام) جادو گر سجدہ میں گر پڑے۔ وہ بول اٹھے: ہم سارے جہانوں کے (حقیقی) رب پر ایمان لے آئے۔“

میرا دل کہتا ہے کہ ان کافروں کو ایمان کی دولت اس "ادب" کے صلہ میں ملی جو انہوں نے مقابلے کے آغاز میں ایک نبی کے احترام میں کیا تھا۔

(۲) بارگاہِ رسالت مآب ﷺ کا دوامی ادب

اللہ رب العزت نے قرآنِ مجید میں جگہ جگہ بارگاہِ رسالت ﷺ کے آداب سکھائے ہیں۔ سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات اس حوالے سے بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، جہاں اللہ تعالیٰ نے امت کو رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھنے، ان کے سامنے اپنی آواز کو بلند کرنے اور انھیں عام طرز پر بلانے کی ممانعت فرمائی ہے اور آپ ﷺ کی بارگاہ کے آداب بجالانے والوں کو متقی قرار دیا ہے۔

یہ بارگاہِ رسالت ﷺ کے وہ آداب ہیں جو ہمیں سکھائے جارہے ہیں۔ افسوس کہ آج ہمارا تصورِ دین اور تصورِ زندگی ادب کے اس پورے تصور سے خالی ہو چکا ہے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ جب حضور نبی اکرم ﷺ کو "بلانے" کا طریقہ ہمارے آپس میں ایک دوسرے کو بلانے جیسا نہیں ہو سکتا، تو حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی کو کوئی اپنی مثل کیسے تصور کر سکتا ہے؟ اگر کوئی امتی ہونے کا دعویٰ کرے، عالم ہو اور دین کا پیغام پہنچا رہا ہو، مگر آقا علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے ایسے کلمات اور لب و لہجہ استعمال کرے کہ سننے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، تو یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ اس رسول ﷺ کی بارگاہ میں بے ادبی کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جس کے لیے اللہ نے یہاں تک فرمادیا کہ اگر ان کی مجلس میں تمہاری آواز ذرا سی بھی بلند ہو گئی، تو تمہاری زندگی کے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے اور تمہیں خبر تک نہ ہو گی۔

آج اگرچہ آقا علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ظاہری اور جسمانی طور پر ہمارے سامنے موجود نہیں، مگر آپ ﷺ کا اسمِ مبارک، آپ ﷺ کی نبوت و رسالت، آپ ﷺ کی سنت و حدیث اور آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ قیامت تک امت کے پاس موجود ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ آقا علیہ السلام کا روحانی وجود آج بھی ہمارے درمیان ہے، لہٰذا ادب کا یہ تقاضا کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ مسجدِ نبوی میں جالی مبارک کے سامنے وہی ادب ہے جو ظاہری حیاتِ طیبہ میں تھا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔

احادیثِ مبارکہ (صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ) میں صراحت موجود ہے کہ جو قریب آکر سلام کرتا ہے آقا علیہ السلام خود سنتے ہیں اور جو دور سے درود بھیجتا ہے فرشتے اسے پہنچاتے ہیں۔ احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آقا علیہ السلام کا ادب آج بھی ویسا ہی واجب ہے جیسا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں تھا۔ آپ ﷺ کی نسبتوں کا ادب، آپ ﷺ کی گلی کوچوں کا ادب، آپ ﷺ کی سنت، آپ ﷺ کے اسمِ گرامی، آپ ﷺ کے ذکر کی محفل اور مجلسِ حدیث؛ یہ سب ایمان کا حصہ ہیں۔ اگر ہماری گفتگو اور کلام سے آقا علیہ السلام کا ادب نکل جائے اور ہم ایسے الفاظ منتخب کریں جن

سے ان کی شان میں ادنی سی بھی کمی آئے، تو سمجھ لیں کہ دل سے ایمان اور دین رخصت ہو گیا۔

صحیح بخاری، مسند احمد بن حنبل اور صحیح ابن حبان کی مستند احادیث میں صلح حدیبیہ کے موقع کا ایک واقعہ درج ہے۔ عروہ بن مسعود (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) نے جب حدیبیہ کے میدان میں صحابہ کرام کا اپنے نبی ﷺ کے ساتھ والہانہ تعلق دیکھا، تو واپس جا کر مشرکینِ مکہ سے کہا: "لوگو! ان سے جنگ نہ کرنا، میں اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ کر آیا ہوں کہ ان کے غلام ان کا کس طرح ادب کرتے ہیں۔ وہ تمہیں ان کی جان تک کبھی نہیں پہنچنے دیں گے۔ وہ اُن کے وضو کے پانی کے قطروں، لعابِ دہن اور سر کے بالوں تک کو نیچے نہیں گرنے دیتے۔"

(الطبرانی، المعجم الکبیر، ۲۰: ۹، الرقم: ۱۳)، (صحیح بخاری، کتاب الشروط، ۲: ۹۷۴، الرقم: ۲۵۸۱)

یہ سیرت کی عام کتابوں کی باتیں نہیں بلکہ صحیح بخاری کی حدیث ہے، جو 1500 صحابہ کے متفقہ عمل اور ان کے ایمان کی گواہی دے رہی ہے۔

آج ہمارا معاشرہ اور تصورِ دین ادب سے اتنا خالی ہو گیا ہے کہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان معمولات کا ذکر کیا جائے، تو کچھ لوگ اسے "شخصیت پرستی" کا نام دے دیتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم نے صحیح بخاری و مسلم کو یا تو پڑھا نہیں، یا پھر ان حقائق سے آنکھیں چرا لی ہیں۔ یوٹیوب اور سوشل میڈیا پر بیٹھ کر من گھڑت باتیں تو کی جاتی ہیں، مگر بارگاہِ رسالت ﷺ کے ان آداب کو چھپایا جاتا ہے جو صحابہ کا شیوہ تھے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضور نبی اکرم ﷺ کے سامنے ہو رہا تھا؛ لعابِ دہن کو اٹھانا، وضو کا پانی یا موئے مبارک (بال) لینا، اگر یہ "شخصیت پرستی" ہوتی یا شرک و بدعت کے زمرے میں آتا، تو آقا علیہ السلام اسے سختی سے منع فرما دیتے۔ لیکن آپ ﷺ کی خاموشی اور اسے برقرار رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عینِ ایمان اور ادب کا حصہ تھا۔ ہم نام تو صحابہ اور اہل بیت کا لیتے ہیں، مگر ہمارے عمل اور عقیدہ کا ان کے نقشِ قدم سے کوئی میل نہیں ہے۔

☆ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ایک روایت بیان کی ہے، اس کا بنیادی مضمون صحیح بخاری و مسلم میں بھی موجود ہے۔ کچھ لوگوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کے علمِ مبارک پر شک کیا، تو آپ ﷺ جلال میں منبر پر تشریف لائے اور فرمایا:

سَلُونِی فانکم لاتسئلونی عن شئی الا انبتکم به

آج مجھ سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ آج تم دنیا و آخرت کا جو سوال کرو گے، میں اسی منبر پر کھڑے کھڑے جواب دوں گا۔

لوگوں نے طرح طرح کے سوال کیے۔ عبداللہ بن حذافہ ؓ جنھیں لوگ طعنہ دیتے تھے، انھوں نے اپنے باپ کا نام پوچھا اور کسی نے مرنے کے بعد اپنا ٹھکانہ پوچھا۔ (صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ۶: ۲۶۶۰، الرقم: ۶۸۶۴) جب لوگوں کے بے جا سوالات بڑھے اور آقا ﷺ کے چہرۂ انور پر جلال کے آثار نظر آئے تو سیدنا عمر فاروق ؓ تڑپ کر کھڑے ہو گئے: فقبل رجلہ (ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲: ۱۰۶)

آقا ﷺ کے قدمِ مبارک پر گر کر ان کا بوسہ لینے لگے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! معاف فرما دیں، جس سے بھی غلطی ہوئی، اسے در گزر فرمائیں۔ ہم اللہ کے رب ہونے، آپ کی رسالت و نبوت اور قرآن کی امامت پر دل و جان سے راضی ہیں۔

یہ ہے وہ مقامِ ادب جہاں ایک جلیل القدر صحابی اپنے نبی کے جلال کو دیکھ کر ان کے قدموں میں گر جاتا ہے تاکہ امت کی بخشش کا سامان ہو سکے۔ اگر ہماری گفتگو اور کلام سے یہ ادب نکل جائے، تو سمجھ لیں کہ دین کی بنیاد ہی گر گئی۔

☆ امام بخاری نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "الادب المفرد" میں باقاعدہ ابواب قائم کیے ہیں جن میں صحابہ کرام ؓ کا حضور نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک اور قدمِ مبارک چومنے کا ذکر ہے۔ (البخاری، الادب المفرد، باب: ۴۴۴۔۴۴۵، ص: ۳۳۸۔۳۳۹) علمِ حدیث کا یہ اصول ہے کہ جب کوئی محدث کسی خاص موضوع پر "باب" قائم کرتا ہے، تو وہ دراصل اپنا علمی مسلک اور عقیدہ بیان کر رہا ہوتا ہے۔ امام بخاری کا "ہاتھ اور پاؤں چومنے" کا باب قائم کرنا اور اس کے تحت احادیث لانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسے عینِ ادب اور جائز سمجھتے تھے۔ جامع ترمذی اور دیگر کتبِ حدیث میں بھی اس حوالے سے کثیر روایات موجود ہیں کہ صحابہ کرام ؓ نے مختلف مواقع پر بارگاہِ رسالت ﷺ میں کس درجہ کے والہانہ ادب کا مظاہرہ کیا۔

صحابہ کرام ؓ کے اس شعورِ ادب کو آج ہمیں اپنے مذہبی شعور، ذکرِ رسول ﷺ اور نسبتِ رسول ﷺ میں زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے اندر یہ ادب باقی نہ رہا تو پھر تباہی مقدر ہے۔ "بے ادب، بے دین" کا جملہ صرف کہنے کی بات نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے؛ کیونکہ ادب نہ رہے تو نہ نسبتِ رسول ﷺ باقی رہتی ہے اور نہ ہی دین کی روح۔

ادب کا وہی شعور واپس لانا ہوگا جو ابو بکر و عمر اور صحابہ کرام ؓ کے ادب کا معیار تھا۔ تحریکِ منہاج القرآن کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ اس نے امت کو ادب کا شعور دیا ہے اور یہ شعور محض جذباتی نہیں بلکہ پوری دلیل کے ساتھ دیا ہے۔ ہم نے ادب سے معمور ایمان کا وہ تصور پیش کیا ہے جو براہِ راست

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرتے تھے تو ان کی زبانوں پر حیا اور ادب کی وہ حدود ہوتی تھیں جو آج ہمارے ہاں مفقود ہو چکی ہیں۔ آج کل ہم اپنی زبانوں سے وہ حیا کھو چکے ہیں، ہم ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے ہوئے حدود پامال کر دیتے ہیں اور ایسے بات کرتے ہیں جیسے کسی عام یا مخالف آدمی کی بات کر رہے ہوں۔

★ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے۔ وہاں ایک چمڑے کا مشکیزہ لٹکا ہوا تھا جس سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی نوش فرمایا۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے چمڑے کا وہ حصہ کاٹ کر سنبھال لیا جہاں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لبِ مبارک لگے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ کیوں کاٹا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہاں آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لبِ مبارک لگے ہیں، اب مجھے یہ گوارا نہیں کہ یہاں کسی اور کا منہ لگے اور کوئی بے ادبی ہو جائے۔ (الطبرانی، المعجم الاوسط، ۱: ۲۰۴، الرقم: ۶۵۴)

گزشتہ چودہ سو سال میں کسی امام نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس ادب کو "مبالغہ" نہیں کہا۔ یاد رکھیں! ادب تو نام ہی معمول کے عمل سے ہٹ کر اس والہانہ پن کا ہے جو عام فہم سے بالا ہو۔ جب بارگاہ اونچی ہوتی چلی جاتی ہے، تو حسنِ ادب کا مرتبہ اور اس کے تقاضے بھی بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ آداب تھے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ کے لیے قائم کیے تھے۔

بقائے دین کا راز: شعورِ ادب کی منتقلی

دین اور ایمان کا قصر جب تک قائم ہے، وہ اسی ادب کے شعور کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ جس دن معاشرے سے ادب کا یہ خاص جوہر رخصت ہو گیا، تو ڈر ہے کہ کہیں وہاں سے دین اور ایمان بھی رخصت نہ ہو جائے۔ لہٰذا، علمائے کرام، وعظ کرنے والے، مساجد کے خطباء اور سوشل میڈیا کے ذریعے لاکھوں تک اپنی آواز پہنچانے والے مبلغین کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنی نسلوں کی مٹتی ہوئی اقدار کو بچائیں، ان کے اندر حیا پیدا کریں اور ان کے ڈگمگاتے ہوئے ایمان کی حفاظت کریں، تو ہمیں "ادب سے لبریز دین" کا تصور واپس لانا ہوگا۔ ہمیں ایک ایسا اسلامک کلچر منتقل کرنا ہوگا جو سراپا ادب ہو۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا علیہ السلام سے قیامت کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نشانیاں بتاتے ہوئے فرمایا:

"قیامت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب اکابر (بڑوں) سے تعلق کاٹ دیا جائے گا اور 'اصاغر' (چھوٹوں/نااہلوں) سے علم حاصل کیا جائے گا۔"

(الطبرانی، المعجم الکبیر، ۲۲: ۳۶۱، الرقم: ۹۰۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب معاشرے میں بڑوں کی عزت و احترام ختم ہو جائے گا، ان سے فیض پانے کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور وہ لوگ جو علمی و اخلاقی لحاظ سے "چھوٹے" اور ظرف میں تنگ ہوں گے، وہ خود کو بڑا بنا کر پیش کریں گے اور لوگ ان کی پیروی کریں گے؛ تو سمجھ لو کہ فتنوں کا دور شروع ہو گیا۔

اکابر سے تمسک: خیر و برکت کی ضمانت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

جب تک مسلمان اپنا علم آقا علیہ السلام کے صحابہ سے لیتے رہیں گے، وہ خیر پر رہیں گے لیکن وہ زمانہ ہلاکت کا ہو گا جب لوگ اپنے اسلاف پر طعن زنی کریں گے، ان پر تنقید کو فیشن سمجھیں گے اور ان سے علم لینے کو عار (شرم) محسوس کریں گے۔

(الطبرانی، المعجم الکبیر، ۹: ۱۱۴، الرقم: ۸۵۹۲)

صحابہ کرام ﷺ سے علم لینے کا مطلب وہی "ادبِ صحابہ" ہے جو میں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر ان کے بعد یہ سلسلہ نسل در نسل اکابرین سے آگے منتقل ہوتا رہا اور حضرت حسن بصری، بایزید بسطامی، بشر الحافی، جنید بغدادی، معروف کرخی، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، داتا گنج بخش علی ہجویری اور بابا فرید الدین گنج شکر (رحمہم اللہ) جیسے نفوسِ قدسیہ سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا۔ جب تک امت اپنے ان اکابر سے علمی و روحانی رشتہ استوار رکھے گی، خیر باقی رہے گی۔ آج کا دور ایسا ہی ہے جہاں انٹرنیٹ سے معلومات لے کر ہر کوئی علامہ بن جاتا ہے، مگر اس نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیے ہوتے۔ امام شافعی ﷺ نے کیا خوب فرمایا:

من تفقه من بطون الكتب ضيع الاحكام۔

"جس نے دین کا علم صرف کتابوں کے اوراق سے سیکھا اور اکابر علماء کے سامنے بیٹھ کر سلیقہ نہیں سیکھا، اس نے دین کے احکام کو ضائع کر دیا۔" (ابن جماعۃ الکتانی، تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم، ص: ۱۹۷)

سلف صالحین کے علمی آداب کے چند نمونے

۱۔ خطیب بغدادی نے روایت کیا ہے کہ لوگ اکابر علماء اور مشائخ کی اس طرح تعظیم کرتے تھے جیسے اس دور میں خلفاء اور بادشاہوں کی کی جاتی تھی۔ ایسا خوف سے نہیں بلکہ محبت اور علمی مرتبے کی وجہ سے تھا۔ (الخطیب البغدادی، الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع، ۱: ۱۸۲، رقم: ۲۸۸)

۲۔ حضرت یحییٰ بن عبدالملک الموصلی بیان کرتے ہیں کہ امام مالک بن انس ﷺ کی مجلس میں ان کے شاگرد اس طرح بیٹھتے کہ کسی کو آواز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوتی، سب سراپا ادب ہوتے تھے۔ (ایضاً، الرقم: ۲۸۹)

۳۔ امام یحییٰ بن سعید القطان (جو فنِ حدیث کے بہت بڑے امام ہیں) نے نمازِ عصر کے بعد حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ ان کے سامنے اس وقت کے جلیل القدر محدثین، جن میں امام علی بن المدینی، امام یحییٰ بن معین اور خود امام احمد بن حنبل جیسے لوگ شامل تھے، وہ سب ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ عصر سے لے کر مغرب کی اذان تک یہ تمام ائمہ، جن کے نام سے آج دنیا واقف ہے، صرف ادب کی وجہ سے بیٹھے بھی نہیں اور کھڑے ہو کر اپنے استاد سے حدیث کا سماع کرتے رہے۔ (ایضاً، ص: ۱۸۵، الرقم: ۲۹۹)

یہ وہ ادب کے پیکر تھے جنہوں نے علم کو محض الفاظ نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید تہذیب بنا کر امت تک پہنچایا۔

۴۔ سلف صالحین کے ہاں ادب کا معیار یہ تھا کہ امام احمد بن حنبل، جو خود ایک بہت بڑے امام ہیں، جب دیکھتے کہ ان کے استاد امام شافعی گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے ہیں، تو وہ ان کے گھوڑے کی رکاب پکڑ کر ساتھ ساتھ پیدل چلنا شروع کر دیتے تھے۔ کسی نے اس منظر کو دیکھ کر انہیں طعنہ دیا کہ آپ اتنے بڑے عالم ہو کر ایک سوار کی رکاب پکڑ کر چل رہے ہیں؟ امام احمد بن حنبل نے جواب دیا: "دیکھو! اس گھوڑے کی دوسری رکاب ابھی خالی ہے، اگر تم نے بھی علم کا کوئی راز پانا ہے اور علم کی حقیقت تک پہنچنا ہے، تو تم بھی اس دوسری رکاب کو پکڑ لو اور ہمارے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دو۔" (ابن عبد البر، الانتقاء، ص: ۷۵)

۵۔ امام دارمی نے اپنی کتاب میں باقاعدہ علماء کے ادب پر ایک باب قائم کیا ہے۔ امام ربیع بیان کرتے ہیں کہ امام شافعی کا رعب اور ان کا ادب ہمارے دلوں میں اس قدر بسا ہوا تھا کہ اگر وہ ہماری طرف دیکھ رہے ہوتے، تو پیاس کی شدت کے باوجود ہماری یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ہم پانی کا ایک گھونٹ بھی بھر سکیں۔ ہم ان کے سامنے پانی پینا بھی بے ادبی تصور کرتے تھے۔
(سنن الدارمی، باب فی توقیر العلماء، ۱: ۱۲۲)

۶۔ خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں سلف صالحین کا یہ طریقہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کا ذکر کرتے ہوئے کبھی تنہا نام نہیں لیتے تھے، بلکہ ان کی عدم موجودگی (غیاب) میں بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی تعظیمی لقب ساتھ لگاتے تھے۔ (الطیب البغدادی، الجامع لاخلاق الراوی، ۱: ۱۸۲، رقم: ۲۹۰)

یہ اس "خیر القرون" کا کلچر تھا جس کی گواہی خود آقا علیہ السلام نے دی ہے کہ میرا زمانہ بہترین ہے، پھر میرے بعد آنے والوں کا اور پھر ان کے بعد آنے والوں کا۔ ان اعلیٰ نسلوں میں اکابر کے ادب کا عالم ہی کچھ اور تھا۔

۷۔ مسند دارمی میں امام زہری بیان کرتے ہیں کہ میں علم حاصل کرنے کے لیے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے گھر جایا کرتا تھا۔ میرا ان سے اتنا قریبی تعلق تھا کہ اگر میں چاہتا تو بلا جھجک گھر کے اندر داخل ہو سکتا تھا، لیکن میرا ادب مجھے یہ نہیں کرنے دیتا تھا۔ میں باہر چوکھٹ پر جا کر بیٹھ جاتا اور کبھی ان کے دروازہ پر دستک نہیں دیتا تھا کہ میں آ گیا ہوں۔ میں اس وقت تک خاموشی سے انتظار کرتا جب تک وہ خود دروازہ نہ کھول دیتے۔

(الدارمی، السنن، ۱: ۱۵۰، الرقم: ۵۷۰)

جب اس درجۂ ادب کے ساتھ علم حاصل کیا جاتا ہے، تو پھر انسان اپنے وقت کا امام بن کر علم کے آسمان پر سورج کی طرح چمکتا ہے۔

۸۔ یہی حال حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا تھا۔ آپ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے دروازے پر جا کر بیٹھ جاتے۔ آپ حضرت علی شیرِ خدا رضی اللہ عنہ کے کزن اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت میں سے تھے، لیکن جب استاد کے پاس جاتے تو ان کے دروازے پر بیٹھ جاتے۔ اس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک وہ خود باہر نہ نکلتے۔ ائمہ بتاتے ہیں کہ بعض اوقات تیز ہوا چلتی، گرد و غبار اڑتا اور آپ کے جسم و لباس پر پڑتا، کبھی سخت دھوپ آجاتی مگر آپ نے کبھی دروازہ پر دستک دینا گوارا نہیں کیا کہ کہیں استاد کے آرام میں ذرہ برابر خلل نہ پڑ جائے۔

(السمھودی، جواہر العقدین فی فضل الشرفین، ص: ۳۴۳)

سلف صالحین کا یہی مستقل طریقہ تھا اور یہی وہ دور تھا جب ایمان، دین اور اسلام اپنی اصل روح کے ساتھ سلامت تھے۔

ایک نبوی پیشین گوئی: کثرتِ خطباء اور قلتِ فقہاء

ہم جس زندگی اور جس دور میں آج موجود ہیں، اس کا تذکرہ امام بخاری کی کتاب "الادب المفرد" میں حدیث نمبر 789 کے تحت ملتا ہے۔ یہ دین، ایمان، ادب اور حیا کا وہ تصور ہے جو آقا علیہ السلام نے عطا فرمایا تھا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی منزلوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں اور تابعین سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إِنَّكُمْ فِي زمان كَثِيرٍ فُقَهَاءُهُ قَلِيلٌ خُطَبَاءُهُ۔

"اے لوگو! تم آج ایک ایسے زمانے میں ہو جس میں دین کا حقیقی فہم رکھنے والے (فقہاء) بہت زیادہ ہیں، مگر خطاب کرنے والے (خطباء) بہت کم ہیں۔ آج کا دور وہ ہے جہاں مانگنے والے اور حاجت مند کم ہیں لیکن اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے زیادہ ہیں۔ آج تمہارا نیک عمل تمہاری خواہشاتِ نفسانی کا قائد (Leader) ہے، یعنی تمہاری خواہشیں تمہارے نیک عمل کی پیروی کرتی ہیں۔ (البخاری، الادب المفرد، الرقم: ۷۸۹)

پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مستقبل کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے فرمایا: تمہارے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں دین کا حقیقی فہم رکھنے والے لوگ کم ہو جائیں گے (قلیل فقہاء) اور خطاب کرنے والے بہت زیادہ ہو جائیں گے (کثیر خطباء) اس دور میں مانگنے والے اور مال بنانے والے تو بہت ہوں گے، لیکن للہیت کے ساتھ خرچ کرنے والے کم رہ جائیں گے۔ سب سے بڑی نشانی یہ بتائی کہ اس زمانے میں خواہشاتِ نفسانی "قائد" بن جائیں گی اور نیک عمل پیچھے رہ جائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں فقہاء اور خطباء کا جو موازنہ کیا گیا ہے، اس میں ایک گہرا راز پوشیدہ ہے۔ بہت سے لوگ جو خطاب کو بطور پیشہ (Profession) اپنا لیتے ہیں، وہ اکثر دین کے حقیقی فہم سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ دین کی سچی معرفت، اس کے آداب، اس کی حیا اور اس کی اصل قدروں کے عارف نہیں ہوتے۔

اس زمانے میں تو سوشل میڈیا نہیں تھا، مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ "سوشل میڈیا سپیکرز" اور "یوٹیوبر خطباء" کی ایک فوج ظفر موج آگئی ہے۔ جس کا جو جی چاہتا ہے، وہ کمپیوٹر پر بیٹھ کر یا سیل فون آن کر کے خطاب شروع کر دیتا ہے۔ یہی وہ امر ہے جس کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ اُس زمانے میں دین کی حقیقی معرفت اور فہم بہت کم لوگوں کے پاس ہو گی۔ ادب، حیا اور شعور جو دین کی اصل روح ہے، اسے تھامنے والے کم رہ جائیں گے۔ آج ہمارے دور میں جھوٹ اور بداخلاقی کے ہاتھ میں قیادت آگئی ہے اور انسان کا نفس اسے جس طرف چاہتا ہے، لے جاتا ہے۔

پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس دورِ زوال کا حل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! جان لو کہ جب آخری زمانہ آئے گا تو اس وقت 'حسنِ ادب' سیکھنا بہت سے نیک اعمال سے زیادہ بہتر اور افضل ہو گا۔"

اچھا اخلاق، حیا، بہترین سیرت، گفتگو کا سلیقہ، طرزِ کلام اور بزرگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا ڈھنگ؛ اسے "حسنِ ادب" کہتے ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا:

آخری زمانے میں بہت سے نفلی اور دینی عمل ایسے ہوں گے جن سے بڑھ کر درجہ حسنِ ادب کا ہو گا۔ کیونکہ اگر کسی عمل کی بنیاد میں ادب اور حیا موجود نہ ہو، تو وہ عمل بے کار اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ جب عمل سے ادب نکل جائے تو روح نکل جاتی ہے۔ لہٰذا اس دور میں اپنے ایمان کو بچانے کے لیے ہمیں اسی ادب کے شعور کی طرف پلٹنا ہو گا جو صحابہ اور سلف صالحین کا خاصہ تھا۔

★ امام مالک نے اپنی "موطا" میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی اس روایت کو ایمان افروز اضافوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ آپ ؓ نے اپنے دور اور آنے والے زمانوں کا تقابل کرتے ہوئے ایک عظیم نکتہ ارشاد فرمایا:

"اے انسان! جان لے کہ جس زمانے میں تو اس وقت موجود ہے، یہاں دین کا فہم رکھنے والے فقہاء کثیر ہیں اور قرآن پڑھ کر خطاب کرنے والے خطباء بہت کم ہیں۔ یعنی اس دور کا حسن یہ ہے کہ یہاں قرآن کی دی ہوئی حدوں اور دین کی حدود کی حفاظت کی جاتی ہے اور انہیں قائم رکھا جاتا ہے۔"

لیکن ساتھ ہی آپ ؓ نے ایک ہولناک نقشہ کھینچا کہ عنقریب وہ زمانہ بھی آئے گا جب قرآن کے حروف اور الفاظ کو تو بڑا محفوظ کیا جائے گا، زبانی کلامی باتیں بہت ہوں گی، لیکن قرآن کی اصل روح اور اس کی حدود کو توڑ دیا جائے گا۔

(مالک، الموطا، ۱: ۱۷۳، الرقم: ۴۱۷)

آج ہم اسی دور میں پہنچ چکے ہیں جہاں اسلام کی اخلاقی حدود، ادب کی حدود اور حیا کی قدروں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ الفاظ کا تحفظ تو ہے مگر اقدار کا جنازہ نکل چکا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے مزید فرمایا:

اجل صحابہ اور تابعین کے دور میں لوگ نمازوں کو طول دیتے تھے؛ ان کا قیام، رکوع اور سجود ذوق و شوق، دلجمعی، کیف اور سرور سے بھرپور ہوتا تھا، جبکہ ان کے خطابات مختصر ہوتے تھے۔ لیکن آنے والے زمانوں میں معاملہ الٹ جائے گا؛ خطبے اور تقریریں تو بہت لمبی لمبی ہوں گی، مگر نمازوں کو چھوٹا (مختصر) کر دیا جائے گا۔

آج کا دور وہی ہے جس کی آپ ؓ نے نشاندہی کی تھی کہ خواہشاتِ نفسانی آگے چلیں گی اور عمل پیچھے پیچھے چلے گا۔ ہم اپنی پوری جدوجہد، اپنی محنت اور اپنی زندگی کو اپنی خواہشوں (مال، عزت، منصب اور شہرت) کے مطابق چلاتے ہیں، جس کی وجہ سے خواہش "قائد" بن گئی ہے اور عمل اس کا پیروکار۔

امام مالک نے یہاں تک فرمایا: قد یقراء القرآن من لا خیر فیہ

ایک وقت ایسا آئے گا کہ قرآن کا بیان اور دین کی باتیں وہ لوگ کریں گے جن کے اپنے وجود میں

رتی برابر خیر نہیں ہو گی۔ جن کی طبیعتوں میں نہ ادب ہو گا، نہ حیا، نہ لحاظ بلکہ ان کے اندر شر ہو گا مگر زبان پر قرآن اور اسلام کا تذکرہ ہو گا۔

(القرطبی، الجامع الاحکام القرآن، ۱: ۴۳۷)

ادب: خصائصِ نبوت کا پچیسواں حصہ

امام بخاری نے "الادب المفرد" میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آقا علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْهَدْيُ الصَّالِحُ وَالسَّمْتُ الصَّالِحُ وَالِاقْتِصَادُ جُزْءٌ مِنْ خَمْسَةٍ وَعِشْرِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ۔

(البخاری، الادب المفرد، ص: ۲۷۶، الرقم: ۷۹۱)

یعنی اچھا ادب سیکھنا، اچھے ادب پر زندگی گزارنا، عمدہ سیرت و اخلاق اور اپنی گفتگو و نقطہ نظر میں اعتدال (اقتصاد) رکھنا؛ یہ نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک لازمی جز ہے۔

یہ وہ صفات اور شمائلِ انبیاء ہیں جن کے بغیر کسی نبی کو نبوت عطا نہیں کی جاتی۔ یہ حدیث امام مالک، امام احمد، امام ابوداؤد اور امام بخاری سب نے روایت کی ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ ادب کے بغیر دین کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ جو شخص ادب سے خالی ہو گیا، وہ حقیقت میں دین سے خالی ہو گیا۔

اہل علم اور اہل دعوت کے آدابِ ظاہر و باطن

علم تب تک "علمِ نافع" نہیں بنتا جب تک اس پر اخلاق کا لباس نہ ہو اور اس کے آداب ظاہر و باطن سے عیاں نہ ہوں۔ سلف صالحین کے نزدیک ایک مبلغ اور عالم کے لیے درج ذیل آداب پر کاربند ہونا ضروری ہیں:

۱۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ خوشی اور بشاشت ہو، نہ کہ خشکی اور ترش روئی۔ وہ لوگوں کے لیے سلامتی کا باعث بنے۔

۲۔ وہ اپنے غصہ پر مکمل کنٹرول رکھے اور کسی کی طبیعت کے لیے اذیت کا باعث نہ بنے۔

۳۔ جب وہ دین کی دعوت دے، تو اپنی زندگی میں انصاف اور تلطف کو اپنائے اور سب کے لیے دل میں محبت رکھے۔

۴۔ اس کے دل میں کسی کے لیے غل، حسد، سختی یا بغاوت کا انداز نہ ہو بلکہ وہ غضب، کبر، ریاکاری اور خود پسندی سے پاک ہو۔

۵۔ اس کی طبیعت میں بخل، طمع، لالچ، فخر اور دنیا طلبی کی حرص نہ ہو اور نہ ہی اسے اپنی مدح (تعریف) کی تمنا ہو۔

۶۔ اس کی گفتگو میں جھوٹ، چالاکی اور ہوشیاری نہ ہو اور وہ گالی گلوچ یا حیا سے خالی کلمات استعمال نہ کرے۔

حصولِ علم سے پہلے حصولِ ادب: اسلاف کا طریقہ

سلف صالحین اور اولیاء فرماتے ہیں کہ جب تک یہ ظاہر و باطن کے آداب و اخلاق کسی میں جمع نہ ہوں، اسے دین کی دعوت ہی نہیں دینی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم دور میں طالب علم دین کا علم حاصل کرنے سے پہلے برسوں تک صرف اپنا ادب سنوارنے پر محنت کیا کرتے تھے تاکہ وہ علم کے بوجھ کو اٹھانے کے قابل بن سکیں۔

۱۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں (یعنی تابعین کے دور میں) لوگ علم حاصل کرنے سے پہلے سالہا سال صرف ادب، حیا اور حسنِ سیرت سیکھنے پر صرف کر دیتے تھے۔ یہ اس لیے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ جب تک برتن (کردار) پاکیزہ نہ ہو، اس میں علم کا نور نہیں ٹھہر سکتا۔ (ابن جماعۃ الکنانی، تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم، ص: ۳۱)

۲۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"مجھے اولیاء، صلحاء اور علماء کے حالات و حکایات سننا اپنی فقہی مسائل کی مجلس سے زیادہ پسند ہے۔"

(ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ، ۱:۱۲۷)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کے واقعات سے زندگی کا عملی ادب معلوم ہوتا ہے اور یہی ادب دین کی اصل جان ہے۔

۳۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اپنا بچپن یاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میری والدہ مجھے نصیحت کرتی تھیں کہ "بیٹے! حضرت ربیعہ کی مجلس میں جایا کرو اور ان سے علم سیکھنے سے پہلے 'ادب' سیکھا کرو۔" (ابن فرحون المالکی، الدیباج المذہب، ص: ۲۰)

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ جس کے پاس ادب نہیں ہوتا، اس کا علم اس کے لیے نفع بخش ہونے کے بجائے سانپ اور اژدہا بن جاتا ہے جو اسے اور معاشرے کو ڈستا ہے۔ علم بغیر ادب کے ایک ایسا زہر ہے جو انسان میں تکبر پیدا کر دیتا ہے۔

۴۔ حضرت عبد الرحمن بن قاسم جو امام مالک کے جلیل القدر شاگرد ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں

حضرت امام مالک کی صحبت میں 20 برس رہا۔ ان بیس سالوں میں 18 برس میں نے صرف اور صرف آپ سے "ادب" سیکھا، اور بقیہ دو سالوں میں علم، فنون اور روایات حاصل کیں۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو وہ رو پڑے اور کہنے لگے: "آج میرے دل میں یہ تمنا ہے کہ کاش! آخری دو سال جو میں نے علم سیکھنے پر لگائے تھے، وہ بھی ادب سیکھنے پر ہی لگا دیتا۔" (محمد بن فتح السوسی، الدرۃ الخریدہ۔۔، ۲: ۳)

۵۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا کہ "حقیقت میں دین کا دو تہائی (3/2) حصہ ادب ہے۔"

(ابن الجوزی، صفۃ الصفوہ، ۲: ۳۳۰)

۶۔ سلف صالحین تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہمیں ادب کا ایک باب سیکھ لینا علم کے 70 ابواب سیکھنے سے زیادہ محبوب ہے۔

(ابن جماعۃ الکنانی، تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم، ص: ۳۲)

ہمیں جو کچھ ادب سے ملتا ہے، وہ خالی علم سے حاصل نہیں ہوتا۔ اگر علم ہو اور ادب نہ ہو تو وہ ہلاکت ہے، لیکن اگر علم کم بھی ہو اور ادب کامل ہو، تو وہ حسنِ سیرت اور حیا کی صورت میں دین کی روح کو سلامت رکھتا ہے۔

ادب ہی دین کی سلامتی ہے

دین اور ادب کا انتہائی گہرا رشتہ ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگیاں حقیقی دین کے نور سے منور ہو جائیں، تو ہمیں زندگی کے ہر معاملے میں ادب کو واپس لانا ہوگا۔ چاہے وہ عالم ہو یا داعی، کارکن ہو یا مبلغ، باپ ہو یا ماں، بیٹا ہو یا بیٹی؛ ہر ایک پر یہ واجب ہے کہ وہ دین کو بچانے کے لیے ادب اور حیا کی ان اقدار کو پھر سے زندہ کرے۔ انہی حدود کو قائم کرنے سے دین کی سلامتی ہوتی ہے جو سلف صالحین کا طریقہ تھا۔

تحریکِ منہاج القرآن دراصل "ادبِ دین" کی تحریک ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود پر پختہ ایمان، حقیقی معرفت اور ادب سے معمور دین ہی وہ راستہ ہے جو ہماری زندگیوں کو دمِ آخر تک منور رکھے گا۔ جب ہمارا وجود ادب سے منور ہوگا، تب ہی ہمیں کامل دین نصیب ہوگا اور اسی میں ہمارے ایمان کی حفاظت ہے۔

آپ کے فقہی مسائل

حج وقربانی کی فضیلت

دارالافتاء تحریک منہاج القرآن زیرنگرانی: مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

سوال: ماہ ذوالحجہ کی پہلی دس راتوں کی فضیلت کیا ہے؟

جواب: حج وقربانی کی مناسبت سے ماہ ذوالحجہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کثیر برکتیں اور سعادتیں عطا کر رکھی ہیں۔ ماہ ذوالحجہ کی پہلی دس راتوں کو عظمت وفضیلت کا وہ خزانہ عطا کیا گیا ہے کہ ہر ایک رات رمضان المبارک کی لیلۃ القدر کے برابر ہے۔ جس طرح رمضان المبارک کی برکتوں کو سمیٹ کر عید الفطر میں رکھ دیا گیا اور اس دن کو خوشی کے دن کے طور پر مقرر کر دیا گیا۔ ان دس راتوں کے اختتام پر اللہ رب العزت نے عید الاضحیٰ کے دن کو مسرت وشادمانی کے دن کی صورت میں یادگار حیثیت کر دی۔ اس دن کو عرف عام میں قربانی کی عید کہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ أَيَّامٍ أَحَبُّ إِلَى اللهِ أَنْ يُتَعَبَّدَ لَهُ فِيهَا مِنْ عَشْرِ ذِي الْحِجَّةِ يَعْدِلُ صِيَامُ كُلِّ يَوْمٍ مِنْهَا بِصِيَامِ سَنَةٍ وَقِيَامُ كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْهَا بِقِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ قَا۔

(الترمذی، السنن، ۳: ۱۳۱، الرقم: ۷۵۸)

"اللہ تعالیٰ کو اپنی عبادت بجائے دوسرے اوقات و ایام میں کرنے کے عشرہ ذوالحجہ میں کرنی محبوب تر ہے۔ اس کے ایک دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے برابر ہے اور اس کی ایک ایک رات کا قیام، لیلۃ القدر کے قیام کے برابر ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان دس دنوں (عشرہ ذی الحجہ) میں اللہ تعالیٰ کے حضور نیک عمل جتنا پسندیدہ و محبوب ہے کسی اور دن میں اتنا پسندیدہ و محبوب تر نہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! اللہ کے راستہ میں جہاد بھی نہیں، فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں۔ ہاں وہ شخص جو اپنی جان اور مال کے ساتھ نکلا اور کچھ لے کر گھر نہ لوٹا۔"

(ابوداود، السنن، ۲: ۳۲۵، الرقم: ۲۴۳۸)

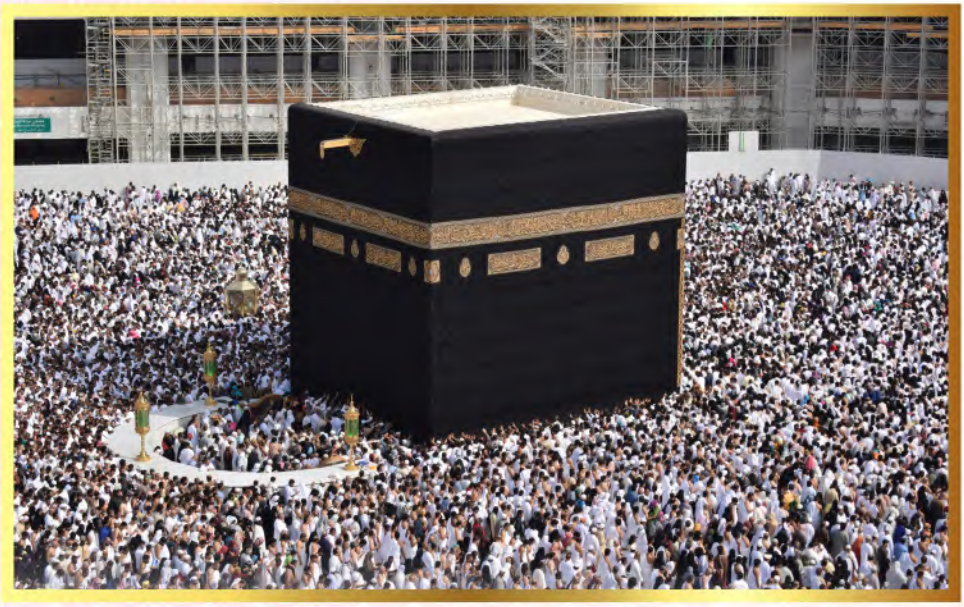

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں عشرۂ ذی الحجہ میں جن اعمال کے کرنے کی فضیلت آئی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ذکر الٰہی کا اہتمام کرنا

اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں ان دس دنوں میں اپنا ذکر کرنے کا خصوصی طور پر تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ۔ (الحج، ۲۲: ۲۸)

اور مقررہ دنوں کے اندر اللہ کے نام کا ذکر کرو۔

صحابہ کرام اور محدثین و مفسرین کے نزدیک ان ایام معلومات سے مراد عشرہ ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔

۲۔ کثرت سے تہلیل، تکبیر اور تحمید کہنا

امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی دن بارگاہ الٰہی میں ان دس دنوں سے زیادہ عظمت والا نہیں، اور نہ ہی کسی دن کا (اچھا) عمل اللہ کو ان دس دنوں کے عمل سے زیادہ محبوب ہے پس تم ان دس دنوں میں کثرت سے لا الہ الا اللہ ، اللہ اکبر اور الحمد للہ کہو۔

سلف صالحین اس عمل کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔ امام بخاری نے بیان کیا ہے کہ ان دس دنوں میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہما تکبیر کہتے ہوئے بازار نکلتے اور لوگ بھی ان کے ساتھ تکبیر کہنا شروع کر دیتے۔

۳۔ بال ناخن وغیرہ نہ کاٹنا

کوئی شخص قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اور ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو جائے تو اسے چاہئے کہ قربانی کرنے تک اپنے ناخن بال وغیرہ نہ کاٹے۔ ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ وَعِنْدَهُ أُضْحِيَّةٌ يُرِيدُ أَنْ يُضَحِّيَ فَلَا يَأْخُذَنَّ شَعْرًا وَلَا يَقْلِمَنَّ ظُفُرًا۔

"جب عشرہ ذی الحجہ داخل ہو جائے (یعنی ماہ ذی الحجہ کا چاند نظر آئے) اور جس شخص کے پاس قربانی ہو اور وہ قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔" (مسلم، الصحیح، ۳: ۱۵۶۵، الرقم: ۱۹۷۷)

سوال: حج کی اہمیت وفضیلت کے بارے میں آگاہ فرمائیں؟

حج اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ یہ ہر اس شخص پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے جو صاحب استطاعت ہو۔ حج، اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ایسا رکن ہے جو اجتماعیت اور اتحاد و یگانگت کا آئینہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ (آل عمران: ۹۷)

"اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو"۔

حج کرنے والے کے لئے جنت ہے۔ حجاج کرام خدا کے مہمان ہوتے ہیں اور ان کی دعا قبولیت سے سرفراز ہوتی ہے۔ یہ نفوس ہر قسم کی برائی کا خاتمہ کرنے کا عہد کرتے ہوئے نیکیوں کے حصول کی جانب ایک نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص زندگی میں استطاعت کے

باوجود حج نہ کرے تو وہ رب کائنات کی رحمتوں سے نہ صرف محروم ہو جاتا ہے بلکہ ہدایت کے راستے بھی اس کے لئے مسدود ہو جاتے ہیں۔ احادیث مبارکہ میں حج کی بہت زیادہ فضیلت بیان ہوئی ہے:

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ۔

”ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک کا درمیانی عرصہ گناہوں کا کفارہ ہے، اور حج مبرور (مقبول) کا بدلہ جنت ہی ہے۔“

(البخاری فی الصحیح، ابواب العمرۃ، ۲/ ۶۲۹، رقم: ۱۶۸۳)

۲۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ کرم سے نکال دیتا ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ أَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ، فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًّا وَإِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا۔

”جس شخص کو فریضۂ حج کی ادائیگی میں کوئی ظاہری ضرورت یا کوئی ظالم بادشاہ یا روکنے والی بیماری (یعنی سخت مرض) نہ روکے اور وہ پھر (بھی) حج نہ کرے اور (فریضہ حج کی ادائیگی کے بغیر ہی) مر جائے تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر (اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے)۔“ (الترمذی فی السنن، باب ماجاء فی التغلیظ فی ترک الحج، ۳/ ۱۷۶، رقم: ۸۱۲)

۳۔ اس عظیم سعادت کو حاصل کرنے والے کو بخشش کی نوید سناتے ہوئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْحُجَّاجُ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللهِ۔ إِنْ دَعَوْهُ أَجَابَهُمْ، وَإِنِ اسْتَغْفَرُوْهُ غَفَرَ لَهُمْ۔

”حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں، وہ اس سے دعا کریں تو ان کی دعا قبول کرتا ہے اور اگر اس سے بخشش طلب کریں تو انہیں بخش دیتا ہے۔ (ایک روایت میں) جہاد کرنے والا، حج کرنے والا اور عمرہ کرنے والا (کے الفاظ بھی ہیں)۔“

(ابن ماجہ فی السنن، باب فضل دعاء الحج، ۹/۲، رقم: ۲۸۹۲)

سوال: قربانی کی فضیلت بیان فرمائیں؟

لغت میں قربانی کا مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ

القربان مایتقرب به الی الله وصار فی التعارف اسماً للنسیکة التی هی الذبیحة۔ (المفردات للراغب ص ۴۰۸)

''قربانی وہ چیز جس کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے،اصطلاح شرع میں یہ قربانی جانور ذبح کرنے کا نام ہے۔''

ارشاد فرمایا:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ اللهُ مِنْ مبهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ (الحج،۲۲:۳۴)

''اور ہم نے ہر امت کے لئے ایک قربانی مقرر فرمائی کہ اللہ کا نام لیں، اس کے دیئے ہوئے بے زبان چوپائیوں پر۔''

احادیث مبارکہ میں بھی قربانی کی فضیلت کو واضح کیا گیا ہے:

۱۔ امام ترمذی وابن ماجہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَاعَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللهِ مُنى اِهْرَاقِ الدَّمِ واِنَّه، لَيَاْتِیْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاشعارِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا۔ (مشکوۃ ص۱۲۸ باب الاضحیہ)

''ابن آدم نے قربانی کے دن خون بہانے (قربانی کرنے) سے زیادہ خدا کے حضور پسندیدہ کوئی کام نہیں کیا اور بے شک وہ قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور بے شک خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں مقام قبول میں پہنچ جاتا ہے۔ لہذا خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔''

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قربانی کرتے وقت دعا فرماتے:

بِسْمِ اللهِ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّمِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ

''الٰہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ کی آل اور آپ کی امت کی طرف سے قبول فرما۔'' (مشکوۃ ص ۱۲۷)

دوسری روایت میں ہے کہ

اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَنِّیْ وَعَمَّنْ لَّمْ يُضَحِّ مِن اُمَّتِیْ۔

''الٰہی یہ میری طرف سے اور میرے ان امتیوں کی طرف سے قبول فرما جو قربانی نہیں کر سکے۔'' (مشکوۃ ص ۱۲۸)

۳۔ احنش کہتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو مینڈھے قربانی کرتے دیکھا، میں نے پوچھا یہ کیا؟ فرمایا:

اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَوْصَانِیْ اَنْ اُضَحِّیَ عَنْهُ۔ فَاَنَا اُضَحِّ عَنْهُ۔

”رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس بات کی وصیت فرمائی تھی کہ میں حضور کی طرف سے قربانی کروں۔ سو میں سرکار کی طرف سے (بھی) قربانی کرتا ہوں۔“ (ابوداؤد، ترمذی وغیرہ، مشکوۃ ص۱۲۸)

سبحان اللہ! کیسے سعادت مند ہیں وہ اہل خیر، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، رسول اکرم ﷺ کی طرف سے آج بھی عمدہ قربانی دیتے ہیں۔ یقیناً آقا ﷺ کی روح خوش ہوگی اور یقیناً اس کے طفیل ان کی اپنی قربانی بھی شرف قبولیت پائے گی۔

۴۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَاهٰذِهِ الْاَضَاحِيُ قَالَ سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ عليه السَّلَامُ قَالُوْا فَمَالَنَا فِيْهَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ بِكُلِّ شَعْرَةٍ مِّنَالصُّوْفِ حَسَنَةٌ۔

”رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ فرمایا تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ ہمارے لئے ان میں کیا ثواب ہے؟ فرمایا ہر بال کے بدلے نیکی۔ عرض کی: یارسول اللہ! اون کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا اون کے ہر بال بدلے نیکی ہے۔“ (احمد، ابن ماجہ، مشکوۃ)

۵۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اُمِرْتُ بِيَوْمِ الْاَضْحٰى عِيْداً جَعَلَهُ اللّٰهُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ، قَالَ لَه، رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، اَرَاَيْتَ اِنْ لَّمْ اَجِدْ اِلَّا مَنِيْحَةً اُنْثٰى اَفَاَضَحِّيْ بِهَا قَالَ لَا وَلٰكِنْ خُذْ مِنْ شَعْرِكَ وَاَظْفَارِكَ وَتَقُصُّ شَارِبَكَ وَتَحْلِقُ عَانَتَكَ فَذٰلِكَ تَمَامُ اُضْحِيَتُكَ عِنْدَاللّٰهِ۔ (ابوداؤد، نسائی، مشکوۃ ص۱۲۹)

”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے قربانی کے دن عید منانے کا حکم دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے مقرر کی ہے۔ ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ بتائیں کہ اگر میرے پاس منیحہ مؤنث (وہ جانور جو کوئی شخص دوسرے کو دودھ، اون وغیرہ کا فائدہ اٹھانے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے دے، بعد میں واپس کرلے) کے سوا کچھ نہ ہو، کیا اسی کی قربانی کردوں؟ فرمایا نہیں، تم اپنے بال اور ناخن تراشواؤ، مونچھیں ترشواؤ (نہ کہ مونڈھواؤ) زیر ناف بال مونڈھو۔ اللہ کے ہاں تمہاری یہی مکمل قربانی ہے۔“

آپ نے قربانی کا مفہوم کتنا عام فرمادیا کہ اہل ثروت بھی عمل کرسکیں اور عام مفلس مسلمان بھی۔ خیر و برکت کا دریا بہہ رہا ہے، کہ ہر پیاسا سیراب ہو۔

سفرِ حج اور فلسفۂ قربانی

انا کی نفی سے بقا کی منزل تک

پروفیسر منظور الحسن

سفرِ حج اور عملِ قربانی دراصل انا کی نفی سے بقا کی منزل تک کا سفر ہے جو ایک مومن انسان کے باطن میں برپا ہونے والی ایک خاموش مگر انقلاب آفریں جدوجہد کا نام ہے۔ یہ وہ راہ ہے جہاں نفس کی سرکش لہریں تھمتی ہیں اور دل کا دریا سکونِ حق سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ جب انسان اپنی انا کے بت کو اپنے ہی ہاتھوں پاش پاش کرتا ہے، اپنی خواہشات کے شور کو خاموشی کے مزار میں دفن کر دیتا ہے، تو اس کے اندر ایک نئی روشنی جنم لیتی ہے۔ ایسی روشنی جو اسے اپنی ذات کی تنگ و تاریک گلیوں سے نکال کر حقیقت کے وسیع و عریض افق تک لے جاتی ہے۔ یہی نفیِ انا دراصل وہ زینہ ہے جس پر قدم رکھ کر انسان بقا کی رفعتوں تک پہنچتا ہے، جہاں اس کی ہستی ذاتی حدود سے نکل کر الوہی قرب کے نور میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ وہاں نہ "میں" باقی رہتا ہے نہ "میرا"، بلکہ ہر سمت "وہی" جلوہ گر ہوتا ہے، اور انسان فنا کے اس بحرِ بے کراں میں ڈوب کر بقا کی لافانی موجوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ فنا و بقا کے فلسفے کو ہم علامہ اقبال کے اس شعر سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں:

فنا فی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

حضرت علامہ محمد اقبال کے اس فکر انگیز شعر میں ایک ایسا آفاقی پیام مضمر ہے جو روحِ انسانی کو جھنجھوڑ کر اسے حقیقتِ حیات کے دروازے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ محض الفاظ کا سنگم نہیں بلکہ عرفان و آگہی کا وہ

دریا ہے جس کی لہروں میں فنا اور بقاء کے اسرار موجزن ہیں۔ اقبال نے "فنا" کو موت کی تاریکی نہیں بلکہ ایک ایسی سحر انگیز شب سے تعبیر کیا ہے جس کے بطن سے بقاء کی تابندہ صبح جنم لیتی ہے۔

"جسے مرنا نہیں آتا" یہ محض جسمانی موت کا ذکر نہیں، بلکہ یہ انا کے بت کو پاش پاش کرنے کا استعارہ ہے۔ یہ نفسِ امارہ کے اس سرکش گھوڑے کو لگام دینے کی دعوت ہے جو انسان کو خود پسندی کے ریگزار میں بھٹکاتا رہتا ہے۔

"جینا" یہاں محض زندہ رہنے کا نام نہیں بلکہ یہ اس گلِ رعنا کی مانند ہے جو خزاں کے جھونکوں سے لڑ کر بہار کی آغوش میں کھلتا ہے۔ یہ اس پروانے کی مانند ہے جو شمع کی لو میں جل کر بھی ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے۔ یہ وہی بقاء ہے جو فنا کے راستے سے گزر کر حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی دائمی زندگی جس میں بندہ اپنی ذات کو مٹا کر ذاتِ حق میں سمٹ جاتا ہے۔

سفرِ حج و قربانی در حقیقت اسی نفیِ انا سے بقا کی منزل تک کے روحانی سفر کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ جب حاجی احرام کی سادہ چادر اوڑھ کر دنیاوی تفاخر کے تمام نقوش مٹا دیتا ہے تو گویا وہ اپنی "میں" کے بت کو پہلی ضرب لگا دیتا ہے۔ تلبیہ کی صداؤں میں اس کی انا تحلیل ہونے لگتی ہے اور وہ لبیک کہتے ہوئے اپنے وجود کو حکمِ الٰہی کے سپرد کر دیتا ہے۔ میدانِ عرفات میں کھڑے ہو کر وہ اپنی ہستی کی نفی کا اعلان کرتا ہے اور رمیِ جمرات کے ذریعے اپنے نفس کے شیطانی وسوسوں کو سنگسار کرتا ہے۔ پھر جب قربانی کا مرحلہ آتا ہے تو یہ محض ایک جانور کا ذبح نہیں رہتا بلکہ خواہشات، تمناؤں اور خود پسندی کی گردن پر چلتی ہوئی وہ تیز دھار چھری بن جاتا ہے جو انسان کو فنا کے مقام تک پہنچاتی ہے۔ اسی فنا کی راکھ سے بقا کی وہ روشن کرن پھوٹتی ہے جہاں بندہ اپنی محدود ذات سے نکل کر قربِ الٰہی کی لازوال وسعتوں میں داخل ہو جاتا ہے اور یوں حج اور قربانی کا ہر لمحہ اعلان کرتا ہے کہ جو اپنی انا کو ذبح کرنا سیکھ لے، وہی حیاتِ جاوداں کا امین بنتا ہے۔

سفرِ حج: آفاقی شناخت کا ذریعہ

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ۔

"اور تم لوگوں میں حج کا بلند آواز سے اعلان کرو وہ تمہارے پاس پیدل اور تمام دبلے اونٹوں پر (سوار) حاضر ہو جائیں گے۔" (الحج، ۲۲: ۲۷)

یہ اعلان دراصل ایک ابدی دعوت ہے۔ ایک ایسا بلاوا جو انسان کو اس کی اصل کی طرف لوٹنے کی صدا

دیتا ہے۔ یہ روح کی وہ صدا ہے جو انسان کے باطن سے اٹھ کر اسے اپنے خالق حقیقی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ محض رسوم و ظواہر کا نام نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں اتر کر ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے جس میں بندہ اپنے رب کی قربت کو اپنی سب سے بڑی متاع سمجھنے لگتا ہے۔ دین اسلام نے عبادات کو اسی روحانی ارتقا کا ذریعہ بنایا ہے؛ نماز کی خشوع بھری ساعتیں ہوں یا روزے کی صبر آزما گھڑیاں، زکوۃ کی ایثار انگیزی ہو یا حج کی روح پرور حاضری۔۔۔ یہ سب انسان کے اندر ایک نئی تطہیر ایک نئی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ یوں یہ عبادت صرف بندگی کا اظہار نہیں رہتی بلکہ نفس کی اصلاح کردار کی تہذیب اور زندگی کے ہر گوشے کو رضائے الٰہی کے رنگ میں رنگ دینے کا وسیلہ بن جاتی ہے، یہاں تک کہ انسان کا جینا، اس کا بولنا، اس کا لین دین۔۔۔ سب کچھ ایک مقدس امانت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

حج اور قربانی دراصل انسان کے باطن میں برپا ہونے والے اس عظیم معرکہ کی علامت ہیں جسے جہاد بالنفس کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مقدس لمحات ہوتے ہیں جب بندہ اپنی خواہشات اپنی انا اور اپنے ذاتی مفادات کو پسِ پشت ڈال کر مکمل سپردگی کے ساتھ حکمِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ احرام کی سادگی میں لپٹا ہوا وجود گویا اپنی تمام شناختوں سے دستبردار ہو کر ایک نئی روحانی پہچان حاصل کرتا ہے اور قربانی کے وقت چھری فقط جانور کے گلے پر نہیں چلتی بلکہ نفسِ امارہ کی سرکشی پر وار کرتی ہے۔ اس عمل میں انسان اپنی ذات کی نفی کر کے ذات باری تعالیٰ کی رضا میں فنا ہونے کا سلیقہ سیکھتا ہے اور یہی فنا دراصل بقائے دوام کی تمہید بن جاتی ہے۔ یوں بندہ ایک ایسے سفر پر گامزن ہو جاتا ہے جہاں اس کی ہر سانس اطاعت کا استعارہ اور ہر قدم قربِ الٰہی کی طرف ایک روشن پیش رفت بن جاتا ہے۔

حج کی عظیم عبادت محض ایک مذہبی رسم کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ دینِ اسلام کے ایک مکمل فکری، روحانی اور تہذیبی نظام کی نمائندگی کرتی ہے۔ حج ان عظیم عبادات میں سے ایک ہے، جو بیک وقت انسان کے ظاہر و باطن، فکر و عمل اور فرد و اجتماع کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ یہ سفر صرف مکانی نہیں بلکہ ایک باطنی ہجرت ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہنے والا انسان مختلف حوالوں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ کسی ملک کا شہری ہوتا ہے، کوئی زبان بولنے والا، کسی خاندان کا فرد اور کسی پیشے سے وابستہ ہوتا ہے لیکن جب وہ حج کے لیے نکلتا ہے تو یہ تمام شناختیں ثانوی ہو جاتی ہیں۔ یوں اس روحانی سفر میں وہ اپنی محدود شناخت سے نکل کر ایک آفاقی شناخت اختیار کر لیتا ہے۔

یہ خود سے خدا تک۔۔۔ انا سے بقا تک اور محدود شناخت سے آفاقی شعور تک کا یہ سفر انسان کو اس کے اپنے وضع کردہ مصنوعی دائروں اور حدود سے نکال کر اس کی اصل حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔ چنانچہ انا وہ داخلی احساس ہے جو انسان کو اپنی ذات، اپنی برتری اور اپنی خواہشات کے گرد قید رکھتا

ہے۔ حج اس قید کو توڑنے کا نام ہے کیوں کہ جب ایک حاجی احرام باندھتا ہے تو وہ اپنے لباس مرتبہ، قومیت اور دنیاوی امتیازات کو ترک کر دیتا ہے۔ اسی طرح قربانی کا عمل اس باطنی تبدیلی کا عملی اظہار ہے، جس میں انسان اپنی خواہشات مفادات اور انا کو اللہ کی رضا کے لیے قربان کرتا ہے۔ یوں حج اور قربانی مل کر ایک ایسے فلسفہ کو جنم دیتے ہیں جو انسان کو فنا سے بقا کی طرف لے جاتا ہے۔

صوفیا کے نزدیک فنا کوئی منفی یا معدومیت کا تصور نہیں بلکہ ایک ایسی مثبت کیفیت ہے جس میں بندہ اپنی محدود ہستی کو اللہ کی لامحدود ہستی میں جذب کر دیتا ہے۔ جب یہ فنا کامل ہو جاتی ہے تو اسی کے بطن سے بقا جنم لیتی ہے۔ یعنی وہ زندگی جو اللہ کے ساتھ، اللہ کے لیے اور اللہ کی کامل اطاعت میں بسر ہو۔

احرام: انا کی پہلی نفی

حج کا آغاز احرام سے ہوتا ہے اور یہی وہ پہلا مرحلہ ہے جہاں انسان اپنی انا کے خول کو توڑنا شروع کرتا ہے۔ احرام کا سادہ لباس اس بات کا اعلان ہے کہ اب کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ نہ امارت و غربت کا فرق، نہ رنگ و نسل کی تمیز اور نہ زبان و قوم کا تفاخر۔ یہ لباس دراصل کفن کی یاد دلاتا ہے، گویا انسان دنیا کی تمام ظاہری شناختوں کو اتار کر ایک نئی روحانی زندگی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

دورانِ حج احرام کی سادہ سی چادر اس بات کی علامت ہے کہ اب انسان اپنی دنیاوی حیثیتوں کو پسِ پشت ڈال چکا ہے۔ نہ کوئی امیر ہے نہ غریب، نہ کوئی بادشاہ ہے نہ فقیر۔ شاہ و گدا، محمود و ایاز، بندہ و بندہ نواز سب ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ مساوات کا یہ عملی مظاہرہ دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے نزدیک اصل قدر و قیمت تقویٰ اور اخلاص کی ہے۔ دنیاوی شعوب و قبائل، رنگ و نسل اور امتیازاتِ دنیوی کے سب پندار یہاں ٹوٹ جاتے ہیں۔

احرام باندھنے والا حاجی گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ میں نے اپنی ذات کو محدود کر دیا ہے، اپنی خواہشات کو روک دیا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ حالت احرام میں لبیک اللھم لبیک کی صدائے دل نواز ایک داخلی انقلاب کا اعلان ہے کہ اب میں اپنی مرضی اپنی خواہش اور اپنی انا کو ترک کر کے صرف رب کی اطاعت میں داخل ہو چکا ہوں۔ احرام کی حالت میں کئی جائز چیزیں بھی حرام ہو جاتی ہیں، جیسے خوشبو لگانا، بال کاٹنا یا شکار کرنا، یہ پابندیاں انسان کو یہ سبق دیتی ہیں کہ اصل آزادی خواہشات کی پیروی میں نہیں بلکہ ان پر قابو پانے میں ہے۔ یہی وہ پہلا قدم ہے جس سے انا کی نفی شروع ہوتی ہے۔ انسان سیکھتا ہے کہ وہ اپنے نفس کا غلام نہیں بلکہ اللہ کا بندہ ہے۔

طواف: مرکزِ حقیقی کی تلاش

جب حاجی خانہ کعبہ کا طواف کرتا ہے تو وہ دراصل اپنی زندگی کے محور کو متعین کر رہا ہوتا ہے۔ دنیا میں انسان کے کئی مرکز ہوتے ہیں۔ مال و دولت، جاہ و منصب، شہرت و ناموری، انواع و اقسام کی خواہشات دنیوی اور طاقت و اقتدار لیکن طواف یہ سکھاتا ہے کہ انسان کا اصل مرکز و محور اور مقصود و مطلوب صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ چنانچہ کعبہ کے گرد چکر لگانا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اللہ کے گرد گھما دے۔ یہ ایک علامتی عہد و اعلان ہے کہ اب میری زندگی کا ہر عمل، میری ہر سوچ، میرا ہر فیصلہ اللہ کی رضا کے تابع ہے۔ لہٰذا طواف میں انا مزید تحلیل ہوتی ہے اور انسان ایک عظیم کائناتی نظام کا حصہ بن جاتا ہے۔ جیسے سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں، ویسے ہی انسان اللہ کے گھر کے گرد طواف کرتا ہے۔ یہ عمل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ ایک مرکز کے تابع ہے اور وہ مرکز اللہ کی ذات ہے۔

یوں طواف انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ اس کی زندگی کا مرکز بھی کوئی دنیاوی شے نہیں بلکہ صرف اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ نتیجتاً انسان اپنی زندگی کا مرکز دنیا کو نہیں بناتا، نہ وہ کسی فکری انتشار کا شکار رہتا ہے بلکہ وہ اپنے فکر و شعور کو کاملاً اللہ کی طرف منتقل کرتا ہے اور اس کی زندگی میں توازن اور سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

سعی: جستجو اور یقین کا استعارہ

صفا اور مروہ کے درمیان سعی حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی اس عظیم جدوجہد کی یادگار ہے جو انھوں نے اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیاس بجھانے کے لیے کی۔ یہ عمل ہمیں سکھاتا ہے کہ اللہ پر یقین کے ساتھ کی گئی کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ کی سعی بظاہر ایک بے نتیجہ دوڑ تھی لیکن درحقیقت وہی دوڑ آبِ زمزم کے ظہور کا سبب بنی۔ اسی طرح انسان کی زندگی میں بھی بہت سی کوششیں بظاہر بے سود محسوس ہوتی ہیں مگر وہی کوششیں کسی بڑے انعام کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ یہاں بھی انا کی نفی کا پہلو نمایاں ہے۔ انسان اپنی کوشش پر مغرور نہیں ہوتا بلکہ اسے اللہ کی مدد کا محتاج سمجھتا ہے۔ بقول میر درد اسے یقین ہو جاتا ہے کہ:

ہووے نہ حول وقوت اگر تیری درمیاں
جو ہم سے ہو سکے بے سو ہم سے کبھو نہ ہو

وقوفِ عرفہ: خود احتسابی کا لمحہ

عرفات کا میدان حج کا نقطۂ عروج ہے۔ یہاں انسان اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان کھڑا ہو کر اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب بندہ اپنی تمام کمزوریوں، گناہوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر کے اللہ کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے۔ یہاں انا کی دیوار مکمل طور پر ٹوٹ جاتی ہے اور انسان ایک عاجز بندے کی حیثیت سے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے فنا کا سفر مزید آگے بڑھتا ہے۔ اپنی ذات کی نفی اپنے غرور کا خاتمہ اور اپنی خود پسندی، خود نمائی، خود ستائی جیسے مذموم اظہار کو اللہ کے حضور مٹا دیتا ہے۔

قربانی: ترکِ نفس کی عملی تصویر

حج کے بعد قربانی کا مرحلہ آتا ہے، یعنی اگر حج انسان کو اپنی "انا" سے آزاد کرتا ہے تو قربانی اسے اس آزادی کا عملی ثبوت فراہم کرنے کا موقع دیتی ہے۔ قربانی کا لفظ اپنے اندر بندگی، محبت اور ایثار کی ایسی معطر کہکشاں سموئے ہوئے ہے جس کی ہر کرن انسان کو قربِ الٰہی کی طرف رہنمائی دیتی ہے۔ یہ محض ایک رسم یا ظاہری عمل کا نام نہیں بلکہ دل کے محراب میں جلنے والی وہ خاموش شمع ہے جو انسان کو اپنی ذات کے حصار سے نکال کر رضائے حق کی وسعتوں میں داخل کرتی ہے۔ دینی اعتبار سے قربانی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنتِ وفا کی یادگار ہے۔ وہ لمحہ جب باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے اپنی جان کو حکمِ خداوندی کے حضور بے چون وچرا پیش کر دیا اور یوں اطاعت و تسلیم کی ایک لازوال مثال قائم ہو گئی۔ روحانی سطح پر یہی قربانی انسان کے اندر موجود خودی کے بت کو توڑنے، خواہشاتِ نفس کو ذبح کرنے اور انا کی گردن پر اخلاص کی چھری پھیرنے کا استعارہ بن جاتی ہے۔

قربانی دراصل دل کی زمین کو نرم کرنے کا وہ عمل ہے جس میں بخل کی سخت چٹانیں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور ایثار و محبت کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ یہ انسان کو سکھاتی ہے کہ اصل عطا مال کی نہیں بلکہ نیت کی ہے اور اصل ذبح جانور کا نہیں بلکہ نفس کی سرکشی کا ہے۔ جب بندہ اپنی پسندیدہ چیز کو اللہ کی راہ میں پیش کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے دل کو دنیا کی گرفت سے آزاد کر کے رب کی قربت کا حقدار بناتا ہے۔ یوں قربانی ایک ایسا روح پرور سفر بن جاتی ہے جہاں انسان فنا کے مرحلے سے گزر کر بقا کی روشنیوں سے ہمکنار ہوتا ہے اور اس کے وجود میں اخلاص، محبت اور بندگی کی ایک نئی زندگی انگڑائی لینے لگتی ہے۔

دین اسلام میں قربانی محض ایک رسم نہیں، بلکہ یہ روح کی تطہیر، دل کی بیداری اور بندگی کی معراج کا ایک نورانی استعارہ ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس میں انسان اپنے ظاہر کے ساتھ ساتھ اپنے باطن کو بھی خدا کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے اور یوں اس کی زندگی کا ہر گوشہ اطاعت و وفا کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔

قربانی دراصل اس عظیم روایت کی بازگشت ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بے مثال اطاعت اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بے نظیر تسلیم و رضا سے عبارت ہے۔ جب محبتِ الٰہی اپنے عروج کو پہنچی تو باپ نے بیٹے کو قربان کرنے کا عزم کیا، اور بیٹے نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب انسانیت کو یہ سبق ملا کہ بندگی کا تقاضا اپنی سب سے عزیز شے کو بھی راہِ خدا میں نثار کر دینا ہے۔

قربانی ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ اصل ذبح جانور کا نہیں بلکہ نفسِ امّارہ کا ہے۔ انسان جب چھری اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو درحقیقت اسے اپنی انا، تکبر، حرص اور خود غرضی پر چلانا ہوتا ہے۔ اگر یہ باطنی قربانی نہ ہو تو ظاہری عمل محض ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے، جس میں روح کی حرارت اور اخلاص کی روشنی مفقود ہو جاتی ہے۔ قربانی وہ نہیں جو چھری کے نیچے آئے؛ قربانی وہ ہے جو دل کے اندر اتر جائے۔ قرآن کریم کے مطابق "اللہ تک نہ قربانی کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔" گویا یہ عمل دل کی کیفیت کا آئینہ دار ہے، جہاں اخلاص، محبت اور خوفِ خدا ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔

مزید برآں، قربانی ایثار و ہمدردی کا ایک درخشاں باب بھی ہے۔ جب قربانی کا گوشت محتاجوں اور ناداروں میں تقسیم ہوتا ہے تو معاشرے میں محبت، مساوات اور اخوت کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ یہ عمل انسان کو اس کے مال کی محبت سے آزاد کر کے اسے سخاوت اور فیاضی کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔

نماز اور قربانی: لازم و ملزوم رشتہ

قربانی دراصل اس عہد کی تجدید ہے جو بندہ اپنے رب سے ازل میں باندھ چکا ہے۔ یہ عمل انسان کو یاد دلاتا ہے کہ اصل مطلوب خون اور گوشت نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ جب انسان اپنی محبوب ترین شے کو اللہ کی راہ میں قربان کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنی "میں" کو ذبح کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنی ذات (انا) کی نفی کر کے عبدیت کی معراج کو چھوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی دلنشیں اور معنی آفرین آیت "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" اپنے دامن میں بندگی کا وہ جامع پیغام سموئے ہوئے ہے جو انسان کو ظاہر سے باطن اور عمل سے اخلاص کی معراج تک لے جاتا ہے۔ اس آیت میں نماز اور قربانی کا باہم ذکر محض ایک ظاہری ترتیب نہیں بلکہ ایک گہرا روحانی اور اخلاقی ربط

ہے۔ایسا ربط جس میں عبادت کی قبولیت کا راز مضمر ہے۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قربانی کا عمل، اگرچہ بظاہر ایک عظیم عبادت ہے، مگر اس کی روح نماز کی پابندی کے بغیر بے جان ہو جاتی ہے۔ نماز وہ اساس ہے جس پر تمام عبادات کی عمارت قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد ہی کمزور ہو تو اعمال کی یہ بلند و بالا عمارت بھی منہدم ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ قربانی، جو ایثار و فداکاری کی علامت ہے، اسی وقت بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوتی ہے جب وہ ایک ایسے دل سے صادر ہو جو نماز کے نور سے منور ہو اور جس کی پیشانی سجدوں کی لذت سے آشنا ہو۔

احادیثِ نبویہ اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہیں کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا۔ اگر نماز درست ہوئی تو دیگر اعمال بھی قبولیت کے دروازے پالیں گے اور اگر یہی مردود ٹھہری تو باقی نیکیوں کی حیثیت بھی گردِ راہ سے زیادہ نہ رہے گی۔ گویا: نماز میزانِ اعمال ہے اور قربانی اس میزان میں ڈالی جانے والی ایک قیمتی متاع۔

نماز بندے کا اپنے رب سے روحانی رابطہ ہے، جبکہ قربانی اس رابطے کا عملی اظہار۔۔۔ نماز میں بندہ جھکتا ہے، قربانی میں وہ کٹتا ہے۔۔۔ نماز میں زبان ذکر کرتی ہے، قربانی میں عمل بولتا ہے۔۔۔ نماز جذبۂ بندگی کو بیدار کرتی ہے اور قربانی اس جذبے کی تصدیق کرتی ہے۔۔۔ نماز روح کی تطہیر ہے تو قربانی نفس کی تطہیر ہے۔۔۔ نماز دل کی قربانی ہے تو قربانی نفس کی نماز۔۔۔ نماز انسان کے باطن کو نور سے منور کرتی ہے، جبکہ قربانی اس نور کو عمل کی دنیا میں جلوہ گر کرتی ہے۔

حقیقت میں قربانی کا اصل ہدف ''انا'' کی قربانی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب انسان اپنی خودی، اپنی خواہشات، اپنی ترجیحات، حتیٰ کہ اپنی محبوب ترین چیزوں کو بھی اللہ کی رضا کے حضور نچھاور کر دیتا ہے۔ جب تک یہ باطنی قربانی نہیں ہوتی، ظاہری قربانی اپنی معنویت کھو دیتی ہے۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی قربانیوں کو محض ایک موسمی عبادت نہ بنائیں بلکہ اسے اپنی زندگی کے ہمہ گیر انقلاب کا نقطۂ آغاز بنائیں۔ جس طرح ہم اللہ کی راہ میں جانور قربان کرتے ہیں، اسی طرح اپنی نافرمانیوں، غفلتوں اور باطل خواہشات کو بھی قربان کر دیں، اور نماز کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا لیں۔ تب ہی ہماری قربانیاں قبولیت کا تاج پہنیں گی اور ہماری زندگیاں اس ابدی کامیابی سے ہمکنار ہوں گی جسے قرآن "فلاح" سے تعبیر کرتا ہے۔

آج کے اس پرآشوب زمانے میں قربانی کی روح کہیں رسم کی گرد میں دبتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ عمل جو اخلاص، ایثار اور تقویٰ کی خوشبو سے مہکنا چاہیے تھا، بسا اوقات نمود و نمائش کے شور میں اپنی تاثیر کھو بیٹھتا ہے۔ جانور کی گردن پر چھری تو چلتی ہے مگر دل کے نہاں خانوں میں چھپی خود نمائی

سلامت رہتی ہے۔۔۔ قربان گاہ میں خون بہتا ہے مگر نفس کی سرکشی جوں کی توں قائم رہتی ہے۔۔۔ گلیوں اور محلوں میں قربانی کا چرچا تو ہوتا ہے، مگر اس چرچے کے پس منظر میں اکثر دل کی خاموش نیت نہیں بلکہ زبان کی شہرت اور آنکھ کی تعریف کی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔

بعدازاں جب قربانی کے گوشت کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو وہی ہاتھ جو فیاضی کے لیے غریبوں اور حق داروں کی مدد کے لیے بڑھنے چاہییں، اپنی ہی ضرورتوں کے حصار میں سمٹ جاتے ہیں۔ فریج اور فریزر کی ٹھنڈک تو بھر جاتی ہے مگر دلوں کی حرارت سرد پڑ جاتی ہے؛ دستر خوان تو وسیع ہوتے ہیں مگر مستحق کے دروازے تک پہنچنے والی دستک ماند پڑ جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے کس دردمندی سے فرمایا:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے

حالانکہ قربانی کا اصل پیغام تو یہی ہے کہ اپنی پسندیدہ شے کو راہِ خدا میں دے کر دل کو کشادہ کیا جائے، نہ کہ اسے ذخیرہ اندوزی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ قربانی کی سنت ابراہیمی ہم سے مخاطب ہے کہ اے خود نمائی کے اسیر انسان! ذرا ٹھہر کر اپنے باطن کی آواز سن! کیا تیری قربانی محض دکھاوے کی ایک تصویر تو نہیں۔۔۔؟ کیا تو نے واقعی کچھ قربان کیا، یا صرف ایک رسم ادا کی۔۔۔؟ یاد رکھ، قربانی کا گوشت نہیں بلکہ نیت بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوتی ہے۔ اگر تیرے حصے کا گوشت کسی محروم کے چولہے تک نہ پہنچ سکا تو سمجھ لے کہ تیری قربانی ابھی ادھوری ہے۔ اپنے دل کے آئینے کو صاف کریں، ریاکاری کے دھبے مٹائیں اور اس عمل کو اس کی اصل روح کے ساتھ زندہ کریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سب کچھ کر کے بھی کچھ نہ کر سکیں اور تیرے ہاتھ خالی ہی رہ جائیں۔

خلاصۂ کلام

حج بیت اللہ، قربانی کی سعادت اور روضہ رسول ﷺ کی حاضری؛ یہ محض اعمال نہیں، یہ روح کی بیداری کے دروازے ہیں۔ یہ نصیب کی وہ روشن ساعتیں ہیں جن کے لیے دل صدیوں تڑپتے ہیں، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور زندگیاں دعاؤں میں ڈھل جاتی ہیں۔ یہ وہ لمحات ہیں جب بندہ زمین سے اٹھ کر آسمان سے ہم کلام ہوتا ہے، جب انسان اپنی مٹی کی حقیقت سے نکل کر نور کی طلب میں آگے بڑھتا

ہے۔ مگر اے اہلِ دل! ذرا رک کر خود سے سوال کیجیے کہ کیا واقعی ہم اس سفر سے لوٹ کر بدل جاتے ہیں۔۔۔؟ کیا ہمارے اندر وہ انقلاب آتا ہے جس کے لیے ہم لبیک کی صدا بلند کرتے ہیں۔۔۔؟

یاد رکھیے: اگر حج کے بعد بھی دل دنیا کی حرص میں ڈوبا رہے۔۔۔ اگر قربانی کے بعد بھی نفس اپنی خواہشات کا غلام رہے۔۔۔ اگر روضہ رسول ﷺ کی حاضری کے بعد بھی کردار میں سنت کی خوشبو نہ آئے۔۔۔ تو پھر۔۔۔ یہ سفر محض جسم کا سفر ہے، روح کا نہیں۔۔۔ یہ محض سیاحت ہے، عبادت نہیں۔۔۔ یہ محض حاضری ہے، حضوری نہیں۔

حج ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اپنی انا کو اتار پھینکیں، جیسے احرام میں ہم لباس اتارتے ہیں۔۔۔ قربانی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہم اپنی خواہشات کو ذبح کریں، جیسے ہم جانور کو ذبح کرتے ہیں۔۔۔ اور روضہ رسول ﷺ کی زیارت ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ ہم اپنی زندگی کو سنت مصطفیٰ ﷺ کے سانچے میں ڈھال دیں۔

یومِ عیدِ قرباں اہلِ ایمان کے لیے صرف خوشی اور جشن کا دن نہیں بلکہ ایک عہدِ نو اور ایک روحانی بیداری کا پیغام لے کر طلوع ہوتا ہے۔ یہ دن مسلمان سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آئینے میں جھانک کر دیکھے کہ آیا اس کی عبادتیں صرف ظاہری رسوم تک محدود تو نہیں ہو گئیں، یا ان کے اندر وہ اخلاص اور ایثار کی روح بھی موجود ہے جو قربانی کے اصل مفہوم کو زندہ رکھتی ہے۔ عیدِ قرباں انسان کو یاد دلاتی ہے کہ اصل قربانی جانور کے خون میں نہیں بلکہ نفس کی خواہشات کے خون میں مضمر ہے۔ اصل ذبح غرور اور خود غرضی کا ہے اور اصل اطاعت اللہ کی رضا کے سامنے مکمل سپردگی کا نام ہے۔

یہ دن اہلِ ایمان سے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دلوں کو وسعت دیں، اپنے دسترخوان کو صرف اپنے گھروں تک محدود نہ رکھیں بلکہ اس میں محروموں، محتاجوں اور بے سہاروں کو بھی شریک کریں۔ عیدِ قرباں ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ایمان صرف نماز اور عبادت کا نام نہیں بلکہ ایک اجتماعی احساسِ ذمہ داری بھی ہے، جہاں خوشی تب مکمل ہوتی ہے جب اس کی خوشبو ہر گھر، ہر گلی اور ہر دل تک پہنچے۔

یوں یہ مبارک دن انسان کو ایک نئے عہد کی دعوت دیتا ہے۔ ایسا عہد جس میں انا کی جگہ ایثار، خود غرضی کی جگہ ہمدردی اور دکھاوے کی جگہ خالص نیت جنم لے۔ عیدِ قرباں دراصل ایک خاموش صدا ہے جو دلوں کو جھنجھوڑ کر یہ کہتی ہے کہ اگر تو نے واقعی قربانی کی روح کو پالیا تو تیری زندگی بھی ایک مسلسل قربانی اور مسلسل بندگی میں ڈھل جائے گی اور یہی بندگی تیرے لیے حقیقی عید کا دروازہ کھول دے گی۔

مقصدِ حیات

رضائے الٰہی کی تلاش

شیخ حماد مصطفی المدنی القادری

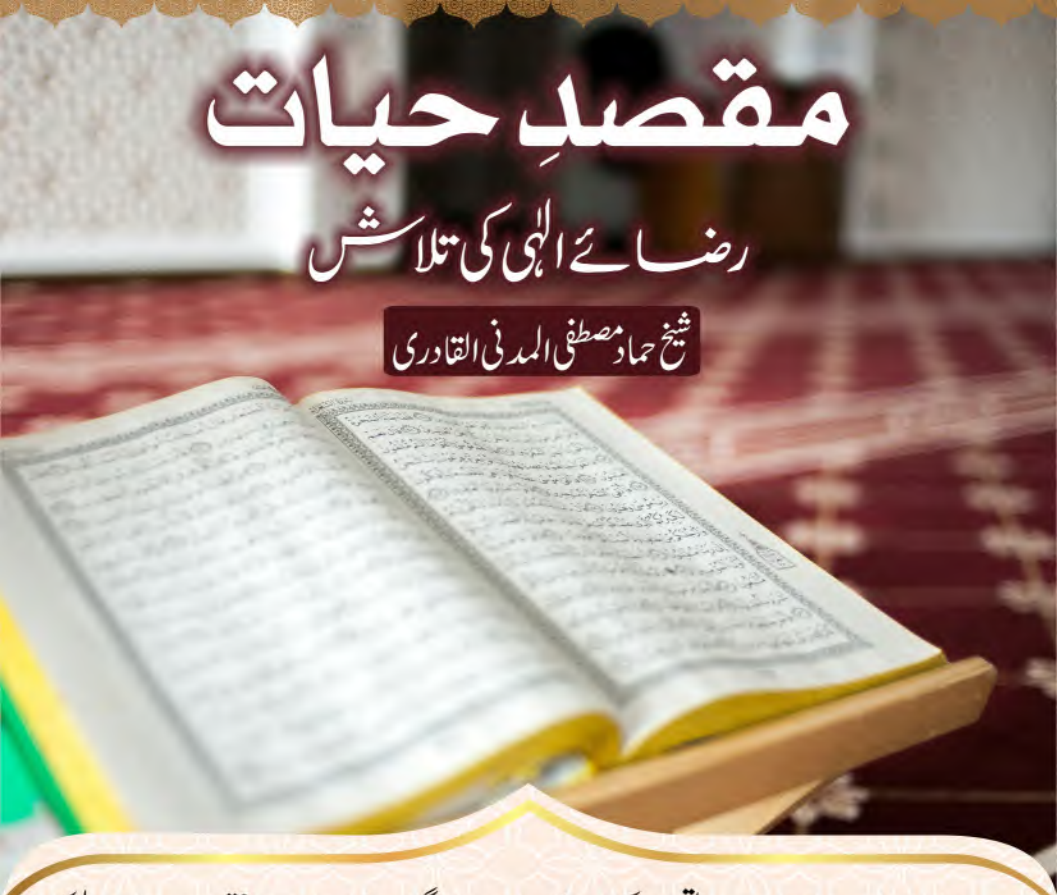

بطور مسلمان ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا مقصد اور ہمارا حتمی ہدف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے۔ ہماری زندگی کا اصل مقام یہ ہے کہ ہم سختی اور آسانی، ہر حال میں مستقل مزاجی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے بن کر رہیں۔ یہ عبادت مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے؛ روایتی شکلوں میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ شامل ہیں جبکہ غیر روایتی شکلوں میں انسانیت کی خدمت، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا (خواہ وہ مالی خرچ ہو یا اپنے قیمتی وقت، دولت اور وسائل کی قربانی)، اللہ کی رضا کے لیے علم حاصل کرنا، کسی کے ساتھ مہربانی اور خوش اخلاقی سے پیش آنا یا کسی ضرورت مند کی مدد کرنا شامل ہے۔ مختصر یہ کہ بطور مسلمان ہمارا مقصدِ زندگی بالکل واضح ہے اور وہ اللہ کی بندگی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات:۵۶)

”اور میں نے جنّات اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی اختیار کریں۔“

قرآنِ کریم کی یہ آیت ہماری تخلیق کے مقصد کو واضح کرتی ہے کہ ہم اس دنیا میں مال و دولت، وسائل، طاقت، رتبہ یا شہرت اکٹھا کرنے کے لیے نہیں آئے، بلکہ ہمارے وجود کا واحد مقصد اللہ کی

عبادت ہے۔اسے ہم "ریورس انجینئرنگ" (معکوس ترتیب) کہتے ہیں۔ ہمیں یہاں کیوں بھیجا گیا ہے ہم یہ سمجھنے کی کوشش اس لیے کرتے ہیں تاکہ ہم اپنا مقصد اور حتمی ہدف سمجھ سکیں۔ ہم اپنے وجود کی وجہ تلاش کرتے ہیں، ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے اندر اپنی روح کیوں پھونکی؟

اس دنیا میں زندگی کا مقصد تلاش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہمارے لیے اللہ کا "تقدیری منصوبہ" کیا ہے؟ یہ منصوبہ ہر فرد کے لیے منفرد ہوتا ہے۔ اگر ہم اس منصوبے اور اپنے لیے اللہ کی رضا کو سمجھنے اور اسے جاننے کا راستہ پالیں، تو گویا ہم نے زندگی کا مقصد جان لیا۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کوئی منصوبہ بناتا ہے تو اس میں "حکمتِ الٰہی" چھپی ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس منصوبے کے ہر قدم پر ہمیں سکون ملے، ہر قدم پر آسانی یا اطمینان میسر ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس منصوبے میں ہمارے امیر بننے، طاقتور یا مشہور و معروف ہونے کا راستہ موجود ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کے منصوبے کے مطابق سفر کر رہے ہوں لیکن ہمارے مالی حالات اچھے نہ ہوں، ہم تکلیف میں ہوں، ہماری صحت خراب ہو، یا ہمیں کسی مالی نقصان یا خاندان کے کسی فرد کی جدائی کا صدمہ جھیلنا پڑے۔

اگر ہم نقصان اٹھا رہے ہیں، یا آرام میں نہیں ہیں، یا پریشان ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ کے پاس ہمارے لیے کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہمارے لیے ایک منصوبہ ہے، اس نے ہمارے لیے ایک حتمی منزل مقصود کر رکھی ہے۔ جب اللہ کسی کے لیے کچھ ارادہ فرماتا ہے، تو وہ ہمیشہ اس کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں وہ مثبت نتیجہ ابھی نظر نہ آ رہا ہو، لیکن وہ مثبت نتیجہ سرنگ کے آخری سرے پر موجود ہے۔

مسلمانوں اور مومنوں کے لیے زندگی کا مقصد یہی ہے کہ اپنے لیے اللہ کی رضا اور اس کے منصوبے کو تلاش کرنا، اور پھر اطمینان و خوشی کے ساتھ خود کو اس منصوبے کے سپرد کر دینا۔ جب یہ مقصدِ حیات ہو تو ہم شکایت نہیں کرتے کہ "اے اللہ! تو نے مجھے اس طرح کی صحت، مال و دولت، شہرت، سہولیات اور پہچان کیوں نہیں دی جو دوسروں کے پاس ہے؟" وہ کبھی تنقید نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کے منصوبے پر بے چین ہوتے ہیں بلکہ وہ سکون میں ہوتے ہیں؛ وہ اس منصوبے کو اطمینان اور خوشی کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ ہم ہر اس چیز کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں جو ہماری راہ میں آئے گی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے رب اور پرورش کرنے والے نے یہ ہمارے لیے طے کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت ہر شے کو کنٹرول کرتی ہے اور ہماری بہتری اور مثبت نتیجہ کے لیے ہر چیز کا تعین کرتی ہے۔ چنانچہ سچے مومنین اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے والے ہمیشہ مطمئن، خوش اور پرسکون رہتے ہیں۔

لوگوں میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اس دنیا، اس کی آسائشوں، تعیشات، مال کی فراوانی، طاقت، شہرت، نام و نمود اور رتبے کے حصول میں مصروف ہے۔ لوگ کارپوریٹ سیڑھی چڑھنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں، اپنے ارد گرد کی اندھی دوڑ (Rat Race) میں جکڑے ہوئے ہیں اور اسی طرف بھاگ رہے ہیں جس طرف یہ دنیا انہیں لے جا رہی ہے۔

لیکن چنیدہ لوگوں کا دوسرا گروہ بھی ہے، جنہوں نے اس اندھی دوڑ کو چھوڑ دیا ہے۔ ان لوگوں نے خود کو ان چیزوں سے آزاد کر لیا ہے جن میں یہ دنیا جکڑ لیتی ہے۔ وہ ان چیزوں کے پابند نہیں رہے جو دنیا انہیں مال، عیش و عشرت، طاقت اور رتبے کی صورت میں ڈکٹیٹ کرتی ہے۔ انہوں نے خود کو آزاد کر لیا ہے۔ یہ چنیدہ لوگ وہ ہیں جو اس دنیا کے لیے خود کو نہیں بیچتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، بلکہ وہ اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں، اس دنیا کا سودا کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے طلبگار رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ م بِالْعِبَادِ۔ (البقرہ: ۲۰۷)

”اور (اس کے برعکس) لوگوں میں کوئی شخص ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بھی بیچ ڈالتا ہے، اور اللہ بندوں پر بڑی مہربانی فرمانے والا ہے۔“

یہ لوگ اس دنیا کو نہیں خریدتے بلکہ وہ اس دنیا کو بیچ دیتے ہیں اور اللہ کی طرف نکل کھڑے ہوتے ہیں؛ وہ عبادت، صدقہ و خیرات، خدمتِ خلق، حصولِ علم اور بہترین اخلاق و کردار کے ذریعے اللہ کی رضا خریدتے ہیں۔ ایک مسلمان اور مومن کا اصل ہدف یہی ہے کہ اس دنیا کو بیچ دے، اپنے آپ کو ان زنجیروں سے چھڑا لے جو اسے اس دنیا میں جکڑے ہوئے ہیں، دنیاوی وابستگیوں سے خود کو الگ کر لے اور اپنے رب سے اپنا تعلق جوڑ لے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کی تلاش کی اہمیت کو اجاگر فرمایا ہے کہ اللہ کی رضا کی خاطر اپنی جائیداد، اپنا مال اور اپنی ملکیت تک قربان کرنا گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ ایک مسلمان اور مومن کے لیے سب سے اعلیٰ مقصد اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ وہ اللہ کی رضا حاصل کر لے اور پھر اللہ کے منصوبے، اس کی مرضی اور اس کے حکم پر راضی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (التوبہ: ۷۲)

”اور (پھر) اللہ کی رضا اور خوشنودی (ان سب نعمتوں سے) بڑھ کر ہے (جو بڑے اجر کے طور پر نصیب ہو گی)۔“

افسوس کی بات ہے کہ اس دنیا نے ہمیں اپنے اندر جذب کر لیا ہے، اس نے ہمیں اپنی طرف کھینچ

لیا ہے اور ہم اپنی سمت کھو بیٹھے ہیں۔ ہماری نظر میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ ہم تعلیم حاصل کریں، اچھی ملازمت پائیں، معقول گزر بسر کریں اور اپنے خاندان کے ساتھ آرام سے رہیں۔ کامیابی صرف پیسے کا نام نہیں ہے۔ کامیابی کا تعین شہرت یا رتبہ سے نہیں ہوتا۔ کامیابی؛ پہچان، اثر و رسوخ، عیش و عشرت یا آرام سے طے نہیں ہوتی بلکہ ایک مسلمان کے لیے کامیابی اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے احسان اور اس کے "رضوان" کو پالینے میں ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے اس دنیا میں سب کچھ حاصل کر لیا، جنھوں نے 50 سے 60 سال مال و دولت، جائیدادیں، مالی کامیابیاں، اثاثے، شہرت اور اثر و رسوخ اکٹھا کرنے میں گزار دیے، وہ اپنے آخری ایام اور آخری لمحات میں پچھتاوے کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ نہایت کامیاب دنیاوی زندگی گزارنے کے باوجود یہ سوچتے ہیں کہ "میری زندگی میں کچھ کمی ہے۔ دراصل وہ کمی مقصدِ حیات کی تلاش میں ناکامی کی کمی ہے جو انھیں پشیمان و نادم کر دیتی ہے۔

اگر ہم یہ انجام نہیں چاہتے، اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ اپنی زندگی کے آخری سالوں، مہینوں، دنوں اور لمحوں میں کسی ایسی چیز کے لیے تڑپیں جو ہم خود گم کر چکے ہوں، تو ہمیں اپنی زندگی ابھی بدلنی ہو گی۔ ہمیں ابھی اپنی سمت درست کرنی ہو گی۔ ہمیں اپنے قطب نما (Compass) کا رخ ابھی بدلنا ہو گا۔ اپنے قطب نما کا رخ اس دنیا سے ہٹا کر آخرت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف موڑنا ہو گا۔ اگر ہم یہ ابھی کر لیں، تو اپنے آخری لمحات میں (وہ جب بھی ہوں) اللہ کے فضل سے ہمیں وہ تڑپ نہیں ہو گی، بلکہ ہمیں یہ اطمینان ہو گا کہ اللہ نے ہمیں اس دنیا میں شاید اتنا زیادہ نہ دیا ہو، لیکن امید ہے کہ اللہ اپنے فضل سے ہمیں آخرت میں سب کچھ عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا دنیا تو کجا جنت اور اس کے اندر موجود تمام نعمتوں سے بھی بڑی نعمت ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب جنت والے جنت میں داخل ہو چکے ہوں گے اور وہاں اپنی آسائشوں اور آرام میں رہ رہے ہوں گے اور ان نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے جو ان کے بہترین اور نیک اعمال کے بدلے میں انھیں عطا کی گئیں تو اللہ انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمائے گا:

اے اہلِ جنت! "کیا تم راضی ہو؟ کیا تم خوش ہو؟" وہ عرض کریں گے: "اے اللہ! ہم بھلا کیوں خوش نہ ہوں گے، جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی اور کو نہیں دیا۔ تو نے ہمیں جنت عطا فرمائی، ہم کیسے خوش نہ ہوں؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا میں تمھیں اس سے بھی بڑی چیز عطا نہ کروں؟" اہلِ جنت جو جنت کی عظیم نعمتوں کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے، وہ حیران ہو کر جواب دیں گے: اے اللہ! جنت سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟

(اللہ فرمائے گا:) "اے اہلِ جنت! میں تمہیں جنت سے بھی بڑی چیز عطا کروں گا اور وہ میری 'رضوان' ہے، میں تمہیں اپنی خوشنودی اور رضا عطا کرتا ہوں، یہ ان تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے جو تم جنت میں پاتے ہو۔

پس اللہ تعالیٰ کی رضا جنت اور اس کے اندر موجود ہر چیز سے بھی بڑی ہے لیکن اللہ کی اس "رضوان" کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں جنت تک پہنچنا ہو گا۔

ہماری زندگی کا مقصد اور حتمی ہدف اللہ کی عبادت کرنا، اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور پھر اللہ کی رضا اور اس کا "رضوان" حاصل کرنا ہے اور اللہ کے فیصلے اور اس کے منصوبے پر خوش رہنا ہے۔ یہی انبیاء اور رسل علیہم السلام کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرماتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلوادی اور سمندر کو عبور کر کے وادیِ سینا میں پہنچے تو یہاں قیام کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے کلام کے لیے کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر انھوں نے عرض کیا:

وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى (طٰہٰ: ۸۴)

" اور میں نے (غلبۂ شوق و محبت میں) تیرے حضور پہنچنے میں جلدی کی ہے اے میرے رب! تاکہ تو راضی ہو جائے۔"

اس میں ہمارے لیے پیغام ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا "رضوان" حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے، تو ہمیں نہ صرف خود کو اس دنیا سے الگ کرنا ہو گا بلکہ

یہ کام بڑی عجلت میں کرنا ہوگا۔ ہمیں دنیا (کی محبت) سے بھاگنا ہوگا اور خود کو اس سے اس طرح کاٹنا ہوگا جس میں تیزی اور رفتار ہو۔ اس معاملے میں ہمیں دیر نہیں کرنی کیونکہ کون جانتا ہے کہ ہم کب تک زندہ رہیں گے؟ پس جب ہم ایک خاص رفتار سے اللہ کی طرف جاتے ہیں تو اللہ اپنی شان اور فضل کے مطابق اس سے بھی زیادہ تیزی سے ہماری طرف متوجہ ہوتا ہے۔

اللہ کی رضا کے لیے اس کی طرف جلدی کرنا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دوڑنا انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت اور ان کا طریقہ ہے۔

جب ہم اللہ کی رضا پالیتے ہیں اور اللہ ہم سے راضی ہو جاتا ہے، تو زندگی کا ہر نقصان اور ہر اتار چڑھاؤ قابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ اب ہم زندگی کی مشکلات، آزمائشوں اور امتحانات میں ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔

عبادات کی قبولیت اور رضائے الٰہی میں فرق

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ یہ دعا مانگتے تھے:

"اے اللہ! میں تجھ سے ان اعمال کا سوال کرتا ہوں جو تجھے پسند ہوں اور جن سے تو ہم سے راضی ہو جائے۔ اے اللہ! ہم سے راضی ہو جا"۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اعمال کے لیے دعا کر رہے ہیں جو اللہ کو راضی کر دیں۔ یہ ایک بہت ہی مرکزی نکتہ ہے؛ اگرچہ تمام عبادات قبول ہوتی ہیں اور ان کا اجر ملتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر عبادت ہمیں اللہ کی رضا بھی عطا کرے کیونکہ عبادات کی درجہ بندی کا اپنا ایک نظام (Hierarchy) ہے۔ ممکن ہے کہ ہم نفل نماز پڑھ رہے ہوں، لیکن ہمارے دروازے کے باہر، ہماری گلیوں، گاؤں یا شہر میں کچھ لوگ غریب اور ضرورت مند ہوں۔ تو کیا اللہ اس نفل نماز سے لازمی طور پر راضی ہوگا یا وہ یہ چاہے گا کہ ہم گلیوں میں نکلیں اور بھوکوں کو کھانا کھلائیں۔۔۔؟ اگر کچھ یتیم ایسے ہیں جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں، جنہیں معاشرے میں سکون میسر نہیں اور دوسری طرف ہم دن رات مسلسل روزے رکھنا شروع کر دیں، تو کیا اللہ ہمارے روزے رکھنے کے عمل سے لازمی طور پر راضی ہوگا؟ وہ ہماری اِن عبادات کو قبول تو کر سکتا ہے کیونکہ یہ اس کا فضل اور رحمت ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ عمل اس کی رضا اور "رضوان" کا ذریعہ نہ بنے۔ کیونکہ اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ باہر نکلیں اور کسی ضرورت مند اور یتیم کی مدد کریں۔

اگر ہمارے کسی مرکزِ علم یا مسجد میں علم کے حلقے قائم ہیں، جہاں اساتذہ حکمت کی تعلیم دے رہے ہیں اور دوسری طرف ہم اپنا وقت گھر میں تسبیح پڑھنے یا نفل پڑھنے میں گزار رہے ہیں، تو ہو سکتا ہے کہ

یہ قبول ہو جائے، لیکن کیا یہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ ہے؟ اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم باہر نکلیں اور علم حاصل کریں۔ جب ہم علم حاصل کرتے ہیں تو ہماری سوچ میں وسعت آتی ہے، دانائی بڑھتی ہے اور دین کے معاملات میں پختگی اور تجربہ بڑھتا ہے۔ پس محض نفل پڑھنا یا تسبیح کرنا شاید اس وقت کا سب سے بڑا تقاضا نہ ہو۔

کچھ ایسی عبادات ہیں جن کی قبولیت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن کچھ ایسے اعمال ہیں جو نہ صرف قبول ہوتے ہیں بلکہ اللہ کے "رضوان" اور اس کی رضا کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے ہمیں اپنی زندگی میں تلاش کرنا چاہیے اور اسی کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔

جو شخص اس کی رضا تلاش نہیں کرتا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لازمی طور پر بدکار یا گناہ گار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہوں، روزے رکھتے ہوں، صدقہ دیتے ہوں اور اچھے انسان ہوں، لیکن وہ لوگ جو ان کے ساتھ ساتھ اللہ کی "رضا" بھی تلاش کرتے ہیں، وہ بنیادی فرائض تو پورے کرتے ہی ہیں لیکن وہ اپنے معمول سے ہٹ کر ایسے کام کرتے ہیں جن سے دوسروں کی مدد ہو، وہ اپنی مقامی کمیونٹی اور معاشرے میں سرگرم ہوتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں، غریبوں، ضرورت مندوں اور یتیموں کی مدد کرتے ہیں۔ وہ ان کاموں کے ذریعے اللہ کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ وہ یہ کام بھی کرتے ہیں جو نہ صرف عبادت ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا ذریعہ بھی ہیں۔

کبھی کبھی کچھ عبادات "ذاتی مفاد" کے لیے ہوتی ہیں، جنہیں "خود غرضانہ" کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اس کا اجر ملے گا لیکن کچھ عبادات "بے غرض" (Selfless) ہوتی ہیں۔ جو عبادات صرف اپنی ذات کے لیے ہوں، وہ صرف ہمیں فائدہ دیتی ہیں، لیکن جو عبادات بے غرض ہوں، ان کے پیچھے اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ اور مقصد نہ ہو تو ایسی عبادات نہ صرف ہمیں فائدہ دیتی ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی سود مند ہوتی ہیں۔ یہی بے غرض اعمال و عبادات اللہ کی رضا اور اس کے قرب کا ذریعہ بنتی ہیں۔

رضائے الٰہی کا ناگزیر تقاضا: امتحان میں کامیابی

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات درست ہے کہ زندگی کا مقصد عبادت، اس کی رضا کے سامنے سر جھکانا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہم صحیح راستے پر ہیں؟

یاد رکھیں! ہم کسی بھی چیز کی حقیقی قدر و قیمت اسے آزما کر یا اس کا امتحان لے کر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ہم تمام مہارتوں کو نکھارنے اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کی مشق کرتے رہتے ہیں لیکن ہمارا امتحان ہی نہ لیا جائے، تو ایسی مشق کا کیا فائدہ؟ ایک فٹ بال یا کرکٹ کا کھلاڑی جو کئی دن گراؤنڈ میں

ٹریننگ کرتا ہے، اچھا کھیلتا ہے لیکن جب میچ کا دن آتا ہے تو وہ کوئی کارکردگی نہیں دکھا پاتا۔ تو اس تمام مشق کا کیا فائدہ؟

اپنے آپ کو یہ یقین دلانا بہت آسان ہے کہ "میں وہ ہوں جو صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی چاہتا ہوں، میں اللہ سے بہت راضی ہوں، مجھے کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی، اللہ نے مجھے دیا یا نہیں دیا، میں اس پر مکمل سکون میں ہوں"۔ لیکن اس بات کی حقانیت کو جاننے کے لیے امتحان ضروری ہے۔ کسی کھیل میں آزمائے بغیر ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہم نے جو مشق کی ہے وہ کارآمد بھی ہے یا نہیں؟

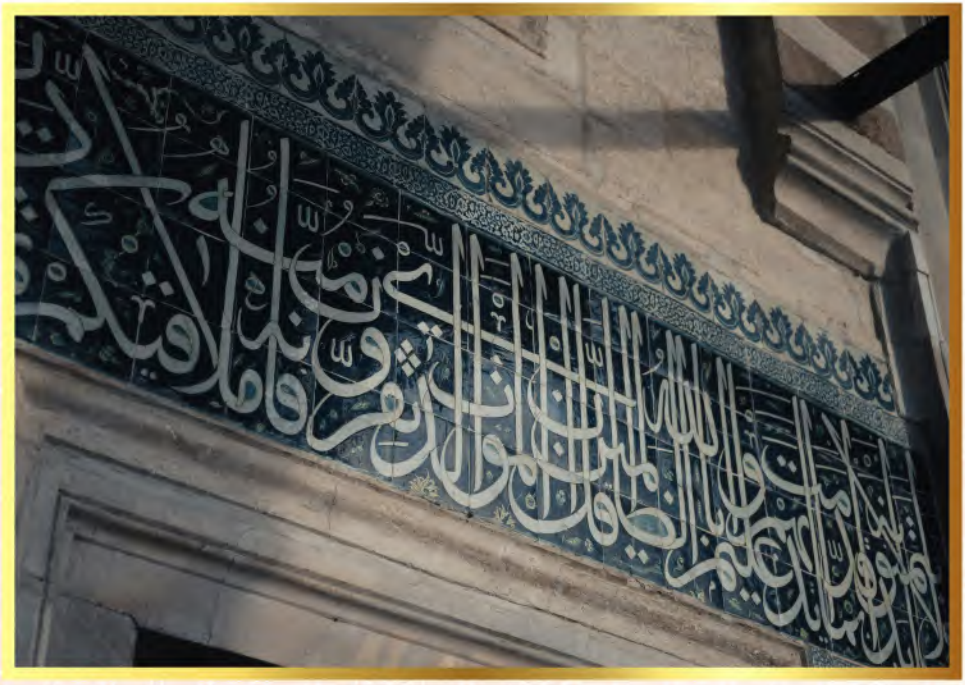

یہی وجہ ہے کہ وہ شخص جس نے واقعی اللہ کی رضا کو پالیا ہے اور اللہ کے ساتھ اس کا تعلق "رضا" اور "رضوان" کا ہے، اس کا امتحان اس کے اس رویے سے ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں "انفاق" (دینے) کے معاملے میں کیسا ہے؟ "انفاق" کا مطلب صرف جیب سے پیسہ یا مال و دولت دینا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب اپنا وقت، اپنے وسائل اور اپنی ذہنی توانائی دین کی خدمت، اپنی مسجد، کمیونٹی، خاندان اور دوستوں کی خدمت کے لیے دینا بھی ہے۔ صدقہ تو اس کا ایک پہلو ہے۔ اگر انفاق کو صرف مال و دولت تک محدود کر دیا جائے تو اس شخص کا کیا ہوگا جس کی جیب میں کچھ نہیں؟ کیا اللہ اسے صدقے کے اجر سے محروم کر دے گا؟ نہیں، بلکہ اس کے لیے صدقہ مختلف شکلیں اختیار کر لے گا۔ جس کی جیب میں کچھ نہیں، اس کے لیے "انفاق اور صدقہ" کا مطلب کسی کو دیکھ کر مسکرانا ہے، کسی کی

مدد کرنا ہے، کسی کا حال پوچھنا ہے یا اپنے کام، پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور گھر والوں کے وقت میں سے کچھ وقت نکال کر کسی کی مدد کرنا ہے۔ "انفاق" ایک جامع نظام ہے، یہ صرف روایتی معنی میں مالی صدقہ نہیں ہے۔

چنانچہ امتحان ہونا ضروری ہے تاکہ دیکھا جائے کہ کیا واقعی ہمیں اللہ کی رضا حاصل ہے اور کیا ہم واقعی اللہ کے حکم اور اس کی مرضی پر راضی ہیں۔ اس امتحان میں کچھ پاس ہو جاتے ہیں اور کچھ فیل۔ اگر ہم سے کوئی ہمارا مال؛ وقت، توجہ، ہمدردی مانگے اور ہم اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر مخلوق اور معاشرہ کی خدمت کے لیے حاضر نہ ہو سکیں تو ہم اس امتحان میں ناکام ہیں اور ہم وہ شخص نہیں ہیں جس نے اللہ کی رضا کو پالیا ہو۔

دوسری طرف اگر ہم اپنی تمام بنیادی ذمہ داریاں (عبادات اور اہل و عیال کے حقوق) پوری کرنے کے بعد اپنا وقت، اپنے وسائل اور اپنی ذہنی توانائی مسجد، کمیونٹی، معاشرے، دوستوں، خاندان اور ضرورت مندوں کے لیے قربان کرتے ہیں، تو واقعتاً ہم نے اللہ کی رضا حاصل کر لی ہے اور اللہ اپنے فضل اور رحمت سے ان شاء اللہ ہم سے راضی ہو جائے گا۔

حصولِ رضائے الٰہی کا انحصار کسی عمل کے قلیل یا کثیر ہونے پر نہیں

یاد رکھیں! اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ عمل یا وہ ذمہ داری کتنی بڑی ہے یا چھوٹی؟ یہ مسجد کی صفائی یا وہاں جھاڑو دینے جتنا چھوٹا کام بھی ہو سکتا ہے اور کسی تنظیم کی سربراہی جتنا بڑا کام بھی۔ ہماری ذمہ داری جو بھی ہو، یہ ہمارا "رویہ" ہے جو طے کرتا ہے کہ ہمیں اس کی رضا حاصل ہے یا نہیں اور اللہ ہم سے راضی ہیں یا نہیں؟ یہی وہ "لٹمس ٹیسٹ" (حتمی معیار) ہے جس کے ذریعے یہ جانچا جاتا ہے کہ آیا ہم اس کی رضا حاصل کرنے کے راستے پر ہیں یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (الرعد: ۲۲)

"اور جو لوگ اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے پوشیدہ اور اعلانیہ (دونوں طرح) خرچ کرتے ہیں۔"

یہاں خرچ کرنے کا مطلب صرف مالی خرچ نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وقت، ذہنی توانائی، کوشش اور مصروفیات و ذمہ داریوں (خاندان، دوستوں اور کام) کے مجموعہ میں سے کچھ حصہ نکال کر اللہ کے لیے دینا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ جو لوگ ایسا پوشیدہ اور علانیہ کرتے ہیں، انہیں آخرت کی زندگی میں بھرپور اجر دیا جائے گا جو کہ دائمی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں "پوشیدہ اور علانیہ" کا ذکر کیوں فرمایا؟ یہ دراصل ہمارے اخلاص اور "اہلِ رضا" ہونے کا ایک اور لٹمس ٹیسٹ (امتحان) ہے۔ بہت سے لوگ معاشرے اور کمیونٹی میں بہت سرگرم ہو سکتے ہیں، وہ سب کے سامنے بہت نیک، پارسا اور پکے مومن نظر آ سکتے ہیں، وہ سچے اور مخلص بھی ہو سکتے ہیں؛ لیکن بعض اوقات یہ امکان ہوتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ محض داد و تحسین یا پہچان کے لیے کر رہے ہوں اور ان کی نیتیں اتنی خالص نہ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم عوامی زندگی میں بہت نیک اور سخی ہیں، تو کیا تنہائی میں بھی ویسے ہی ہیں؟ اگر ہماری خلوت اور جلوت (پوشیدہ اور عوامی زندگی) ایک جیسی ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اخلاص اور اللہ کی رضا کے راستے پر ہیں لیکن اگر ہماری نجی اور عوامی زندگی میں تضاد ہے، تو یہ لمحہ فکریہ ہے؛ شاید ہماری نیت میں وہ اخلاص نہیں ہے، جو ہونا چاہیے، شاید ہم نے ابھی رضائے الٰہی حاصل نہیں کی اور ہمارے اعمال کے پیچھے کچھ دوسرے مقاصد چھپے ہوئے ہیں۔

بعض اوقات ہم خود بھی اپنے ان چھپے ہوئے مقاصد سے واقف نہیں ہوتے۔ یاد رکھیں! اپنی ترغیبات، جذبات اور نیات کو صحیح معنی میں سمجھنے کے لیے بہت گہری بصیرت اور "جذباتی ذہانت" کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنا خود تجزیہ (Self-analysis) کرے کہ وہ لوگوں کی مدد کیوں کر رہا ہے۔۔۔؟ وہ عبادت کیوں کر رہا ہے۔۔۔؟ کیا یہ لوگوں میں شہرت اور رتبہ کے لیے ہے یا صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے۔۔۔؟

اللہ تعالیٰ علانیہ نیکی اور انفاق (خرچ کرنے) کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیونکہ ہمارے دین اور ایمان میں جب ہم باجماعت یا گروہ کی صورت میں نیکی کرتے ہیں، تو اس سے ایک دوسرے کو ترغیب ملتی ہے، ہم ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیکی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ بصورتِ دیگر، اگر ہم گھر میں تنہائی میں ہوں تو شاید اتنے متحرک نہ رہیں اور سستی کا شکار ہو جائیں۔ لیکن جب ہم ایسے لوگوں کے گروہ میں ہوتے ہیں جو عبادت گزار اور نیک ہیں اور دین کی راہ میں اپنا مال، وقت اور توانائیاں خرچ کر رہے ہیں، تو اس سے ہمیں ہمت ملتی ہے۔ اسلام ہمیں صرف پوشیدہ نیکی نہیں بلکہ علانیہ نیکی کا بھی درس دیتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ ہماری نجی اور عوامی زندگی میں مطابقت ہو، ہماری نیت خالص ہو اور ہم صرف اللہ کی رضا کے طالب ہوں۔

زندگی کا معنی اور مقصد؛ اللہ کی عبادت، اس کی مرضی کے سامنے سر جھکانا اور اس کے فضل سے اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سبق کو سمجھنے اور اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

حضور پیر سید ناطاہر علاؤالدین الگیلانی البغدادیؒ

شریعت، طریقت اور حقیقت کا سنگم

محمد یوسف منہاجین

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی معاشرہ اخلاقی پستی اور روحانی خلا کا شکار ہوا، اللہ تعالیٰ نے ایسی پاکیزہ ہستیوں کو مبعوث فرمایا جنہوں نے اپنے علم اور عمل سے بنجر دلوں کو سیراب کیا۔ انہی روشن ستاروں میں سے ایک درخشاں ستارہ قدوۃ الاولیاء حضور پیر سید ناطاہر علاؤالدین الگیلانی البغدادی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو حضور غوث الاعظم سید نا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی مبارک اولاد میں سے تھے۔ آپ ایک ایسی شخصیت تھے کہ جن کی زندگی علم و عمل، شریعت و طریقت، ظاہر و باطن کا حسین سنگم تھی۔ آپ نے نہ صرف روحانیت کی شمع روشن کی بلکہ شریعت و طریقت کے حسین امتزاج سے لاکھوں نفوس کی تربیت فرمائی۔

حضور پیر سید ناطاہر علاؤالدین الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق روئے زمین کے سب سے معتبر اور مقدس علمی و روحانی گھرانے "خاندانِ گیلانیہ" سے ہے۔ آپ حضور غوثِ اعظم سید نا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی براہِ راست اولاد اور ان کے روحانی مشن کے وارث ہیں۔ آپ کا شجرہ نسب نہایت جلیل القدر ہستیوں سے ہوتا ہوا سید السادات امام حسن مجتبیٰؓ اور مولائے کائنات سید نا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم تک پہنچتا ہے۔ بغداد شریف کی سرزمین، جو صدیوں سے علم و عرفان کا مرکز رہی ہے، وہاں آپ کے آباؤ اجداد نے نہ صرف نقابت و تولیت کے فرائض سرانجام دیے بلکہ علمی دنیا میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ یہ خاندان صدیوں سے اسلامی دنیا میں روحانیت کا مرکز رہا ہے۔ بغداد شریف سے لے کر برصغیر پاک

وہند تک، اس خاندان کے بزرگوں نے مسلمانوں کے دلوں میں اللہ کی محبت اور رسولِ اکرم ﷺ کی اتباع کا جذبہ فروزاں رکھا۔

حضور پیر صاحبؒ جس خانوادے کے چشم وچراغ ہیں، اس کی تاریخ محض روحانیت تک محدود نہیں بلکہ یہ خاندان صدیوں سے عالمِ اسلام کی سیاسی اور علمی قیادت کا علمبردار رہا ہے۔ آپ کے جدامجد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے جس طرح بغداد میں مدرسہ قادریہ کے ذریعے علم کی شمع روشن کی، اسی تسلسل کو آپ کے آباؤاجداد نے ہر دور میں برقرار رکھا۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سقوطِ بغداد کے کٹھن حالات ہوں یا عثمانی دورِ حکومت، نقیب الاشراف کا منصب ہمیشہ اس خاندان کے پاس رہا، جو ان کی سماجی اور مذہبی حیثیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ کے والدِ گرامی سیدنا محمود حسام الدین الگیلانیؒ نے جس طرح عراق کی آزادی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کی، اس نے آپ کی شخصیت میں وہ انقلابی فکر پیدا کی جو بعد ازاں آپ کے خطبات اور اصلاحی کاموں میں نظر آئی۔

ا۔ علمی وروحانی مقام

حضور پیر سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانیؒ کی ولادتِ باسعادت بغداد شریف کے اس ماحول میں ہوئی جہاں ہر طرف قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کی صدائیں گونجتی تھیں۔ آپ کے والدِ گرامی سیدنا محمود حسام الدین الگیلانیؒ خود اپنے وقت کے جید عالم اور صوفی باصفا تھے۔ آپ کی ابتدائی تربیت اسی پاکیزہ آغوش میں ہوئی جہاں تقویٰ، پرہیزگاری اور خدمتِ خلق کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ بچپن ہی سے آپ کی پیشانی سے وہ انوارات ظاہر تھے جو مستقبل میں ایک عظیم رہبر کامل کی نوید دے رہے تھے۔

حضور پیر صاحبؒ محض ایک روحانی شخصیت نہیں تھے آپ ایک عبقری عالم بھی تھے جس کی مثال ڈھونڈنا آسان نہ تھا۔ آپ نے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے جہاں روایتی درس وتدریس سے استفادہ کیا، وہاں اپنے والدِ گرامی اور خاندان کے دیگر اکابرین سے بھی فیض حاصل کیا۔ آپ کی علمی شخصیت میں جو ثقاہت اور گہرائی نظر آتی ہے، وہ اسی خاندانی وراثت اور ذاتی محنت کا ثمر تھی۔ آپ نے صرف ظاہری علوم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ باطنی علوم کی تحصیل کے لیے بھی کٹھن مراحل طے کیے۔ آپ کا منہج یہ تھا کہ علم وہی نافع ہے جو انسان کے عمل میں ڈھل جائے اور اسے اپنے خالق کے قریب کردے۔

آپ کی تعلیم وتربیت صرف کتابی نہیں تھی بلکہ اس میں "مشاہدہ" اور "صحبتِ صالح" کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ آپ نے جامعہ بغداد اور دیگر مستند علمی مراکز سے دینی علوم کی تکمیل کی۔ آپ

کے اساتذہ میں اپنے وقت کے وہ جید علماء شامل تھے جن کا علم و زہد پورے عرب و عجم میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ آپ کو علومِ قرآن اور احادیثِ نبویہ ﷺ پر گہری دسترس حاصل تھی۔ آپ کا اندازِ بیان ایسا تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو عام فہم اور دل نشین پیرائے میں بیان فرما دیتے۔ علاوہ ازیں آپ فقہی مسائل میں اعتدال اور وسعتِ نظری کے قائل تھے۔ آپ کا مطالعہ صرف ایک مسلک تک محدود نہ تھا بلکہ آپ تقابلِ ادیان اور مختلف فقہی مکاتبِ فکر کے اصولوں سے بخوبی واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی مجالس میں ہر مکتبِ فکر کے لوگ بلا جھجک شریک ہوتے تھے۔

آپ نے اپنی مجالس میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ "صوفی کو جاہل نہیں بلکہ وقت کا سب سے بڑا عالم ہونا چاہیے" تاکہ وہ زمانے کے فتنوں کا مقابلہ علم اور دلیل سے کر سکے۔ آپ کی گفتگو کا یہ عالم تھا کہ قرآنی، حدیثی، فقہی، معاشی، سیاسی مسائل پر جب رطب اللسان ہوتے تو علماء دنگ رہ جاتے اور علوم کے دریا بہتے۔ حضور پیر صاحبؒ کی گفتگو میں علوم و حقائق اور استنباط و استدلال کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رہوا کرتا تھا۔ آپ اپنے جدِ امجد قطبِ اقطاب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کے علوم و معارف کے حقیقی امین تھے۔

اگرچہ آپ پیدائشی ولی تھے اور آپ کو خاندانی طور پر خلافت حاصل تھی، لیکن طریقت کے آداب کی پاسداری کرتے ہوئے آپ نے اپنے والدِ گرامی حضرت سیدنا محمود حسام الدین الگیلانیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت فرمائی۔ یہ بیعت محض ایک رسم نہیں تھی بلکہ یہ اس عظیم ذمہ داری کا آغاز تھا جس نے آگے چل کر لاکھوں انسانوں کے سینوں کو عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے منور کرنا تھا۔ آپ نے سلوک کی منزلیں نہایت خاموشی اور تندہی سے طے کیں۔ آپ کے قیامِ بغداد کے دوران ہی مشائخِ عرب نے آپ کی روحانی استعداد کو بھانپ لیا تھا اور آپ کو "قدوۃ الاولیاء" کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

۲۔ شخصیت اور تعلیمات کے چند نمایاں پہلو

حضور پیر سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانیؒ کا پاکستان تشریف لانا محض ایک اتفاق نہیں بلکہ ایک عظیم روحانی مشن کا حصہ تھا۔ آپ نے کوئٹہ کو اپنا مسکن بنایا اور پھر یہاں سے پورے ملک میں دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ احوال کا وہ سلسلہ شروع کیا جس نے لاکھوں نوجوانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ آپ کی شخصیت میں وہ مقناطیسی کشش تھی کہ جو ایک بار آپ کی محفل میں بیٹھ جاتا، وہ آپ کا ہو کر رہ جاتا۔ آپ نے ہمیشہ فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر امتِ مسلمہ کی وحدت اور اخلاقی سربلندی کے لیے کام کیا۔ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسی کامل و مکمل شخصیت کے مالک تھے جو آج کے دور میں بہت کم نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی کے چند نمایاں پہلو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) شریعتِ محمدیہ کی پابندی

آپ شریعتِ محمدیہ ﷺ کے سخت پابند تھے۔ راست گوئی، صدقِ مقال اور اکلِ حلال کی ہمیشہ تلقین فرماتے۔ آپ کے طرزِ عمل پر کسی بڑے سے بڑے معترض کو بھی موقع نہ مل سکا۔ آپ کے ملفوظاتِ عالیہ میں یہ گوہر نظر آتا ہے:

"شریعت پر عمل نہ کرنے والے پیر نہیں بلکہ کافر، بے دین، عیش پرست، تن پرست اور شہوت پرست ہیں جو سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔"

یہ الفاظ کسی معمولی عالم کے نہیں بلکہ ایک ایسے روحانی پیشوا کے ہیں جو خود شریعت کا پیکر تھے۔

(۲) شریعت اور طریقت کا حسین امتزاج

حضور پیر صاحبؒ کے نزدیک تصوف کوئی الگ راستہ نہیں بلکہ یہ عینِ شریعت ہے۔ آپ اکثر فرماتے تھے کہ "جس طریقت کی تائید شریعت نہ کرے، وہ گمراہی ہے"۔ آپ نے جاہل صوفیوں کے خود ساختہ تصورات کی سختی سے نفی فرمائی اور اپنے مریدین کو ہمیشہ اتباعِ سنت کا درس دیا۔ آپ کے نزدیک انسان کے ظاہر اور باطن کی اصلاح یکساں ضروری ہے۔ آپ نے واضح فرمایا کہ جس طرح ظاہر کے گناہ (جیسے جھوٹ، چوری) مہلک ہیں، ویسے ہی باطن کے گناہ (جیسے تکبر، حسد، ریاکاری) اس سے بھی زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ انسان ان کا شکار ہو کر بھی خود کو نیک سمجھتا رہتا ہے۔

آپ فرماتے" : شریعت اور حقیقت، اہل طریقت کے لیے اصطلاحات ہیں۔ شریعت: ظاہری عمل اور حال کی صحت کو ظاہر کرتی ہے اور حقیقت: باطن کے احوال کی صحت یا عدم صحت کو۔ اس لیے ایک حقیقی مومن کے لیے ہر دو کا اجتماع ضروری ہے۔"

یہ وہ بنیادی سبق ہے جو آج کے دور میں از حد ضروری ہے جب کچھ لوگ شریعت کو طریقت سے الگ کر کے ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے لگتے ہیں۔ حضرت کا پیغام واضح تھا: دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ہی اسلام کا مقصود ہے۔

(۳) تصوف کا حقیقی مفہوم: غلط فہمیوں کا ازالہ

آج کے دور میں تصوف کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو تصوف کو بالکل رد کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے تصوف کو شریعت سے بالکل کاٹ کر ایک الگ چیز بنا لیا ہے۔ سیدنا طاہر علاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات اس سلسلے میں مشعلِ راہ ہیں۔ آپؒ کا پیغام تھا کہ تصوف یا طریقت دراصل تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کا نام ہے وہ راستہ جو انسان کو اللہ کی حقیقی معرفت کی طرف لے جاتا ہے۔ اور یہ راستہ حضور نبی اکرم ﷺ کی شریعتِ

مبارکہ کے دائرے کے اندر ہی چلتا ہے، اس سے باہر نہیں۔

حضور پیر صاحبؒ کی تربیت کا مرکز "دل" تھا۔ آپ کا ماننا تھا کہ اگر دل زندہ ہو جائے تو نیکی کی قوتیں خود بخود حرکت میں آجاتی ہیں، ورنہ محض ظاہری عبادات میں وہ روح پیدا نہیں ہوتی جو انسان کو بدل سکے۔ آپ نے اپنے مریدین کے لیے درج ذیل تربیتی اصول وضع کیے:

اتباعِ سنت: زندگی کے ہر شعبے میں حضور نبی کریم ﷺ کی سنت کو مشعلِ راہ بنانا۔

گناہوں سے اجتناب: ظاہر اور باطن کے تمام گناہوں کو ترک کرنا کیونکہ گناہ باطنی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

محبتِ الٰہی و عشقِ رسول ﷺ: عبادات کا مقصد محض ثواب کا حصول نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا ہونی چاہیے۔

(۴) درویشی کیا ہے؟

حضور پیر صاحبؒ کا ایک اہم سبق درویشی کا تھا وہ درویشی جو دنیا سے فرار نہیں بلکہ دنیا کی محبت کو دل سے نکالنے کا نام ہے۔ آپ کا ارشاد تھا:

"بھوکا شخص ہر ایک کو بھوکا سمجھتا ہے اور بے عزت شخص ہر ایک کو بے عزت سمجھتا ہے۔"

یعنی انسان کی اندرونی کیفیت ہی اس کے دوسروں کو دیکھنے کا نظریہ بناتی ہے۔ جس کا نفس خواہشات میں گرفتار ہے وہ دنیا کو بھی خواہشات کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور جس نے اپنے نفس کو قابو میں کر لیا وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے آزاد ہے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا" :دلوں میں نفاق، حسد، عناد اور ریاکاری ہو تو پھر کوئی بھی عمل نیکی کا اجر نہیں پا سکتا۔"

یہ ایک گہری تربیتی تعلیم ہے۔ اعمال کا قبول ہونا دل کی سلامتی پر موقوف ہے۔ اگر دل میں کینہ، حسد اور نفاق ہے تو ظاہری عبادات بھی اپنا حقیقی اثر نہیں چھوڑتیں۔

(۵) نسبت اور نسب کی وضاحت

حضرت سید ناطاہر علاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدین کو یہی سمجھاتے کہ کسی بزرگ سے عقیدت کا مطلب ان کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے محض ان کا نام لینا یا ان کے مزار پر حاضری دینا کافی نہیں۔ حضور غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی شریعتِ محمدی پر عمل اور دعوتِ حق کے لیے وقف تھی ان کا سچا متبع وہی ہے جو اسی راستے پر چلے۔ ایک دن آپؒ کی خدمت میں حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا کہ انسانی کردار میں نسب کا کوئی عمل دخل ہے؟ آپؒ نے سائل کی طرف بغور دیکھتے ہوئے فرمایا:

"انسان کے مزاج کی تشکیل، اس کے فطری جوہر چمکانے اور اکثر اوقات اس کی عادت کا تعیّن ؛اس کے ماحول، اس کے خانگی اور خاندانی پس منظر، اس کی تعلیم و تربیت پر منحصر ہے یعنی انسان خود بھی ذمہ دار ہے اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے۔"

یہ ارشاد ایک بڑا تربیتی اصول ہے۔ بہت سے لوگ اپنی خامیوں کا ذمہ اپنے خاندان یا ماحول پر ڈالتے ہیں حضرت نے واضح فرمایا کہ انسان خود بھی ذمہ دار ہے۔ ماحول اور خاندان اثر ڈالتے ہیں لیکن فیصلہ کن کردار انسان کی اپنی سوچ اور اپنے عزم کا ہے۔

(۶) ملفوظاتِ عالیہ

اولیاء اللہ کے اقوال دراصل اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ حضور پیر صاحبؒ کے ارشادات بھی ایسے ہی روشن موتی ہیں جن میں پوری تربیتی حکمت پوشیدہ ہے۔ آیئے ان میں سے چند گوہر ہائے آبدار ملاحظہ کریں:

۱۔ آپ فرماتے تھے:" معرفتِ خداوندی اتباعِ شرعِ محمدی ﷺ میں پوشیدہ ہے۔ حضور ﷺ کی اتباع و غلامی سے ہی محبتِ الٰہی کی منزل نصیب ہوتی ہے۔"

یہ ایک بنیادی اصول ہے جو تصوف کی پوری عمارت کو سمجھنے کی کلید ہے۔ آج بہت سے لوگ محبتِ الٰہی کا دعویٰ کرتے ہوئے شریعتِ محمدی کو نظرانداز کر دیتے ہیں حضرت کا ارشاد اس غلطی کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔

۲۔ آپ کا ارشاد تھا: "ہر اسلامی حکومت یا اسلامی سربراہ نبی اکرم ﷺ کا نائب ہوتا ہے۔ اور حکومت و اقتدار لوگوں کے پاس اللہ اور رسول کی امانت ہے۔"

یہ ارشاد محض روحانی نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی حکمت سے بھرپور ہے۔ جب ہم اقتدار کو امانت سمجھیں تو اس کا استعمال بھی امانتدارانہ ہو گا۔ آج کے دور میں جب حکمران اقتدار کو ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں، یہ ارشاد ایک انقلابی پیغام کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ آپ کا ارشاد تھا: "دھوکہ، چوری اور جھوٹ سے فوری نتیجہ تو (حسبِ خواہش) نکل آتا ہے بلا آخر عزت کو ختم کر دیتے ہیں اور انسان کو تباہ کر دیتے ہیں۔"

یہ وہ سبق ہے جو دنیاوی تجربے سے بھی ثابت ہے لیکن اکثر لوگ فوری فائدے کے چکر میں اسے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حضرت نے اس کو اس سادہ انداز سے بیان فرمایا کہ کوئی ذی شعور انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔

۴۔ آپ نے فرمایا: "اگر شریعتِ محمدی ﷺ کے حوالے سے ہمارے ظاہر و باطن میں

یکسانیت اور اتحاد پیدا ہو جائے تو عالمِ اسلام میں بھی یکجہتی اور اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔"

یہ ایک گہری بات ہے مسلمانوں کا بیرونی اتحاد اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کے باطن میں اتحاد نہ ہو۔ اور باطن کا اتحاد شریعتِ محمدی کی پیروی سے آتا ہے۔

۵۔ ایک نہایت دلچسپ ارشاد جو انسانی نفسیات پر گہری نظر کا مظاہرہ کرتا ہے: "چھوٹے بچے کے پاس 10 روپے بھی ہوں تو سمجھتا ہے کہ میں پورا شہر خرید سکتا ہوں یہی حال ایک کم ظرف شخص کا ہوتا ہے اسے تھوڑا سا مال یا عزت مل جائے تو سمجھنے لگتا ہے کہ میں قارون یا فرعون بن گیا ہوں اور حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔"

یہ ارشاد ہمیں بتاتا ہے کہ دولت یا اقتدار ملنے پر اپنا ظرف کھو دینا ایک کم فہمی کی نشانی ہے۔ اصل ظرف وہ ہے جو مال و دولت میں بھی زمین پر رہے، فرعونی انداز اختیار نہ کرے۔

سیدنا طاہر علاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا محور یہ تھا کہ اللہ کی معرفت شریعتِ محمدی کی اتباع میں ہے، ولایت کرامت کا نام نہیں بلکہ شریعت پر عمل کا نام ہے، روح و جسم دونوں کی اصلاح ضروری ہے، اور نسبتِ غوثیہ ایک زندہ روحانی تعلق ہے جو انسان کو اللہ کے قریب لے جاتا ہے۔ ان کی شخصیت تواضع، خدمتِ خلق، شوقِ عبادت اور علمی گہرائی کا کامل نمونہ تھی۔

حضور پیر سیدنا طاہر علاؤالدینؒ نے تصوف کو "انفرادی اصلاح" سے نکال کر "اجتماعی فلاح" کا ذریعہ بنایا۔ آپ نے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کے خلاف صرف وعظ نہیں کیا بلکہ ایک ایسا ماحول فراہم کیا جہاں انسان کی اخلاقی نشو و نما ہو سکے۔ آپ کے نزدیک "ولی" وہ نہیں جو صرف تسبیح پھیرے، بلکہ وہ ہے جو مخلوقِ خدا کے کام آئے۔

حضور پیر صاحبؒ ایک ایسے مکمل انسان تھے جن کی زندگی علم و عمل، ظاہر و باطن، شریعت و طریقت کا کامل امتزاج تھی۔ ان کی تعلیمات کا مرکز یہ ہے کہ دین مکمل ہے اس میں ظاہری اعمال بھی ضروری ہیں اور باطنی اصلاح بھی۔ دنیا سے بے رغبتی، توکلِ الٰہی، صدقِ مقال اور شریعتِ نبوی کی پابندی یہ وہ اساسیات ہیں جن پر ایک مسلمان کی کامیاب زندگی استوار ہو سکتی ہے۔

۳۔ تحریکِ منہاج القرآن کی سرپرستی

قدوۃ الاولیاء حضور پیر سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانیؒ کی شخصیت جہاں انفرادی تزکیہ نفس کا مرکز تھی، وہیں آپ نے اجتماعی سطح پر امتِ مسلمہ کی بیداری کے لیے اٹھنے والی ہر مخلصانہ تحریک کی بھرپور سرپرستی فرمائی۔ اس سلسلے میں "تحریکِ منہاج القرآن" اور اس کے بانی شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر

القادری سے آپ کی نسبت محض ایک رسمی تعلق نہیں تھا، بلکہ یہ ایک ایسی علمی و روحانی شراکت تھی جس نے خانقاہ اور تحریک کے مابین ایک مضبوط پُل کا کام کیا۔ جب شیخ الاسلام نے اپنے مشن کا آغاز کیا، تو حضور پیر صاحبؒ نے نہ صرف ان کی فکری سمت کی تائید کی بلکہ تحریکِ منہاج القرآن کے "روحانی سرپرست" بن کر اس نوخیز پودے کی آبیاری اپنے دستِ مبارک سے فرمائی۔

آپ کی سرپرستی نے اس تحریک کو وہ روحانی وقار بخشا جو کسی بھی دینی جدوجہد کی کامیابی کے لیے بنیادی روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اکثر منہاج القرآن کی تقاریب میں رونق افروز ہوتے، جہاں آپ کی موجودگی ہزاروں نوجوانوں کے لیے باعثِ سکون و اطمینان ہوتی۔ آپ نے شیخ الاسلام کو "خاندانِ گیلانیہ" کی خاص شفقتوں سے نوازا اور انہیں "علمی و روحانی بیٹا" قرار دیا۔ یہ نسبت اس قدر گہری تھی کہ تحریکِ منہاج القرآن کے دستور اور اس کے علمی ڈھانچے میں "فیضانِ قادریہ" کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

آپ نے تحریک کے کارکنوں کو ہمیشہ یہ سبق دیا کہ "تنظیم" اگر "روحانیت" سے خالی ہو جائے تو وہ محض ایک بے جان ڈھانچہ رہ جاتی ہے۔ آپ کی سرپرستی کا ثمر تھا کہ منہاج القرآن نے علم اور امن کے جس نظریے کو عام کیا، اسے عالمی سطح پر قبولیت حاصل ہوئی۔ آپ کی نظرِ شفقت نے اس تحریک کو فرقہ وارانہ تنگ نظری سے بچا کر ایک جامع اور معتدل علمی پلیٹ فارم بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

آج بھی تحریکِ منہاج القرآن کے مراکز میں آپ کا تذکرہ اسی عقیدت اور احترام سے کیا جاتا ہے جو ایک مرشدِ کامل کا حق ہوتا ہے۔ یہ تعلق ثابت کرتا ہے کہ سیدنا طاہر علاؤ الدینؒ نے جہاں انفرادی قلوب کو بدلا، وہاں انہوں نے ایک ایسی منظم تحریک کی پشت پناہی بھی کی جو آنے والی نسلوں تک اسلام کا حقیقی اور پرامن چہرہ پہنچانے کے لیے وقف ہے۔

تحریکِ منہاج القرآن کے حوالے سے آپ کا کردار ایک "مربی" اور "محافظ" کا تھا۔ شیخ الاسلام کے بارے میں آپ کے یہ الفاظ تاریخ کا حصہ ہیں: "طاہر القادری میرا علمی و روحانی بیٹا ہے، اس نے عشقِ رسول ﷺ کی شمع کو اس دورِ فتن میں جس طرح روشن کیا ہے، وہ میرا اور میرے آباؤ اجداد کا مشن ہے۔"

آپ نے منہاج القرآن کو ایک ایسا پلیٹ فارم سمجھا جہاں سے "جدیدیت اور روحانیت" کا سنگم ممکن تھا۔ آپ نے اس تحریک کی سرپرستی اس لیے فرمائی کیونکہ آپ کا ماننا تھا کہ اسلام کو صرف روایتی خانقاہوں کے ذریعے نہیں بلکہ ایک منظم فکری تحریک کے ذریعے ہی بچایا جا سکتا ہے۔ آپ نے اس رشتے کو ہمیشہ ایک قلبی نسبت کے طور پر نبھایا۔

۴۔ عملی پیغام

حضور پیر صاحبؒ کی حیاتِ طیبہ کا حاصل یہ ہے کہ سچا تصوف انسان کو دنیا سے بے خبر نہیں کرتا بلکہ اسے دنیا کا بہترین شہری بناتا ہے جو اللہ کی محبت میں غرق ہو کر اس کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے۔ آپ کی زندگی اور تعلیمات میں ہمارے لیے کیا عملی پیغام ہے؟ آیئے اسے چند نکات میں سمیٹتے ہیں:

۱۔ شریعت کو زندگی کا محور بنائیں: حضرت کا سب سے بڑا پیغام یہ تھا کہ شریعتِ محمدیہ ہی وہ راستہ ہے جو اللہ تک پہنچاتا ہے اس سے ہٹ کر کوئی راستہ کشف، کرامت، یا تصوف کے نام پر درست نہیں ہو سکتا۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یہ ستون ہیں جن پر باطن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

۲۔ تواضع کو اپنی پہچان بنائیں: ایک عظیم بزرگ جو لوگوں کے لیے کھڑے ہو جاتے، یہ تواضع ہم سب کے لیے سبق ہے۔ آج کے دور میں جب تھوڑا سا علم یا مال ملتے ہی انسان تکبر کا شکار ہو جاتا ہے، حضرت کی مثال ایک آئینہ ہے۔

۳۔ ظاہر اور باطن میں یکسانیت رکھیں: حضرت کا ارشاد تھا کہ جب ظاہر و باطن میں یکسانیت ہو گی تبھی اتحادِ امت ممکن ہے۔ یعنی پہلے فرد کا اپنا باطن درست ہو تب معاشرہ درست ہوتا ہے، اور تب امت درست ہوتی ہے۔

۴۔ اولیاء اللہ سے محبت کو اتباع میں بدلیں: نسبتِ غوثیہ کا مطلب صرف نام لینا یا مزار پر حاضری نہیں بلکہ ان بزرگوں کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی شریعتِ محمدی کے اتباع کی زندگی تھی ان سے سچی محبت وہی ہے جو اس اتباع کو زندگی میں اتارے۔

۵۔ علم کو عمل سے جوڑیں: حضرت نے دونوں کا حسین امتزاج اپنی زندگی میں دکھایا علم کے ساتھ عمل اور عبادت کے ساتھ خدمتِ خلق۔ یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو کامل مسلمان بناتا ہے۔

۵۔ وصالِ باکمال

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، مگر کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا جانا ایک خلا پیدا کر دیتا ہے جسے صدیوں تک پُر نہیں کیا جا سکتا۔ 23 ذوی القعدہ بمطابق 7 جون 1991ء کو آپ اس دارِ فانی سے کوچ کر کے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ نے اپنی آخری سانسوں تک اپنے مریدین اور پسماندگان کو "تقویٰ اور اتباعِ سنت" کی وصیت فرمائی۔ بغداد ٹاؤن لاہور میں واقع آپ کا مزار پر انوار مرجعِ خلائق ہے، جہاں سے فیضانِ قادریہ کی لہریں آج بھی دنیا بھر میں پھیل رہی ہیں۔ آپ کا فیضان، آپ کی تعلیمات اور آپ کا نام آج بھی زندہ و جاوید ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں تحریک منہاج القرآن

اور اپنی اولاد اطہار کی صورت میں جو پودے لگائے تھے، وہ آج قد آور درخت بن چکے ہیں۔ آپ کے مشن کو آپ کے صاحبزادگان حضور پیر سید محمود محی الدین الگیلانی، حضور پیر سید عبد القادر جمال الدین الگیلانی، حضور پیر سید ضیاء الدین الگیلانی نہایت وقار اور استقامت کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں۔

۶۔ خلاصۂ کلام

حضور پیر صاحبؒ کی حیاتِ طیبہ ایک روشن مینارے کی مانند ہے جو آج بھی اپنی روشنی سے ہماری راہ منور کر رہا ہے۔ وہ اپنے آباء واجداد کی طرح شریعت کے پابند، طریقت کے راہنما، حقیقت کے شناور، اور خلق کے خادم تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اس میں ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، فقہ بھی ہے اور تصوف بھی، علم بھی ہے اور عشق بھی، عبادت بھی ہے اور خدمت بھی۔ جو ان تمام پہلوؤں کو یکجا کر لے وہی حقیقی مسلمان ہے۔

حضور پیر سید ناطاہر علاؤالدین الگیلانیؒ کی زندگی کا مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اصل بزرگی کرامات دکھانے میں نہیں، بلکہ احکامِ الٰہی کی پابندی اور انسانیت سے محبت میں ہے۔ آپ نے تصوف کو ایک نئی جہت دی اور ثابت کیا کہ ایک صوفی دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہتے ہوئے بھی اللہ کا مقرب بن سکتا ہے۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ اگر انسان کا تعلق اپنے رب سے مضبوط ہو، تو وہ زمانے کی موجوں کا رخ موڑ سکتا ہے۔ آپؒ آج ہم میں جسمانی طور پر موجود نہیں، لیکن آپ کی تعلیمات، آپ کا فیضان اور آپ کا ذکرِ خیر آج بھی لاکھوں دلوں کو تڑپا رہا ہے۔ آپ کی زندگی ہر اس مسافر کے لیے مشعلِ راہ ہے جو معرفتِ الٰہی کی تلاش میں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم آپ کی تعلیمات کو صرف پڑھنے اور سننے تک محدود نہ رکھیں، بلکہ انہیں اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں حضور پیر صاحبؒ کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ان کی روحانی نسبت کو ہمارے قلوب میں زندہ رکھے، اور ہمیں ان کے راستے پر جو دراصل شریعتِ محمدیہ کا راستہ ہے ثابت قدمی عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید الانبیاء والمرسلین ﷺ

فنِ مطالعہ: ایک علمی و فکری راہنمائی

ڈاکٹر نعیم مشتاق

کتاب پڑھنا بظاہر ایک سادہ عمل معلوم ہوتا ہے، صفحات کھولنا، الفاظ پر نظر ڈالنا اور آخر تک پہنچ جانا۔ لیکن حقیقت اس سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ مطالعہ دراصل ایک فن ہے اور ہر فن کی طرح یہ بھی شعور، نیت اور مکمل حضوری کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مضمون کا آغاز ایک نہایت بنیادی مگر فکر انگیز سوال سے ہوتا ہے کہ کیا ہم واقعی جانتے ہیں کہ کتاب کو کیسے پڑھا جاتا ہے؟ کیا ہم صرف اس کے الفاظ کو سمجھتے ہیں، یا اس کے باطن کی طرف بھی سفر کرتے ہیں اور اس خاموش آواز کو بھی سنتے ہیں جو لفظوں کے پیچھے سانس لے رہی ہوتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کتاب خود کو ہر قاری پر ظاہر نہیں کرتی، وہ صرف اس کے سامنے کھلتی ہے جو اسے پڑھنے کا ہنر رکھتا ہو۔ اس طرح مطالعہ ایک سادہ عمل نہیں رہتا بلکہ ایک ملاقات بن جاتا ہے، ایک ایسا تعلق جو قاری اور ایک زندہ فکر کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ جیسے ہر بامعنی تعلق توجہ، صبر اور آمادگی چاہتا ہے، ویسے ہی کتاب بھی اپنے قاری سے یہی تقاضا کرتی ہے۔

فن مطالعہ کی اہمیت

مطالعہ کا یہ فن جب اپنے حقیقی شعور کے ساتھ سمجھ میں آتا ہے تو یہ انسان کی زندگی کے تین بنیادی پہلوؤں کو گہرائی سے متاثر کرتا ہے:

۱۔ ذاتی زندگی میں یہ انسان کی سوچ کو نکھارتا ہے، اس کے زاویۂ نظر کو وسیع کرتا ہے اور اسے خود اپنے اندر جھانکنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ انسان دوسروں کے تجربات کو پڑھتے پڑھتے اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے اور یوں کتاب ایک آئینہ بن جاتی ہے جس میں وہ اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔

۲۔ روحانی سطح پر یہی مطالعہ ایک نئی بیداری پیدا کرتا ہے، جہاں پڑھنا صرف معلومات حاصل کرنا نہیں رہتا بلکہ غور و فکر کا ذریعہ بن جاتا ہے اور یہی غور انسان کو اپنے رب کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ الفاظ کے درمیان چھپے ہوئے معنی کو محسوس کرتا ہے اور زندگی کو ایک نئے شعور کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے۔

۳۔ پیشہ ورانہ زندگی میں یہی فن علم کو حکمت میں بدل دیتا ہے۔ انسان صرف سیکھتا نہیں بلکہ سمجھتا ہے، جوڑتا ہے اور اپنے کردار اور فیصلوں میں اس علم کو استعمال کرتا ہے۔ اس طرح مطالعہ ایک عادت نہیں رہتا بلکہ ایک مستقل تربیت بن جاتا ہے جو ذہن کو مضبوط، دل کو بیدار اور کردار کو باوقار بناتی ہے۔

کتاب کی اپنی ایک فطرت

کتاب کی اپنی ایک فطرت ہوتی ہے، ایک اندرونی ساخت اور ایک خاموش نظام جو صرف انہی پر کھلتا ہے جو اسے پڑھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ بظاہر اس کے اندر ابواب، عنوانات، جملے اور الفاظ ہوتے ہیں، مگر درحقیقت یہ سب اس کے ظاہر کا حصہ ہیں۔ اس کے باطن میں معانی کی تہیں ہوتی ہیں، سوالات چھپے ہوتے ہیں، اشارے بکھرے ہوتے ہیں اور ایک ایسا فکری سفر ہوتا ہے جو قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اگر قاری محض الفاظ تک محدود رہے تو وہ صرف معلومات حاصل کرتا ہے، لیکن اگر وہ ٹھہر کر پڑھے، غور کرے اور جملوں کے درمیان کے وقفوں کو بھی سمجھے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب اسے پڑھ رہی ہے، اس کے ذہن کو ترتیب دے رہی ہے اور اس کے اندر ایسے دروازے کھول رہی ہے جن کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مطالعہ ایک عمل سے بڑھ کر ایک مکالمہ بن جاتا ہے، ایک ایسا مکالمہ جس میں کتاب بولتی کم ہے اور قاری کو سوچنے پر زیادہ آمادہ کرتی ہے۔

کتاب صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ ایک جیتا جاگتا وجود ہوتی ہے، ایک ایسا وجود جس کا جسم صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور جس کی روح معانی میں بسی ہوتی ہے۔ جب ہم کسی کتاب کو ہاتھ میں لیتے ہیں تو گویا ہم ایک شخصیت سے مصافحہ کرتے ہیں، ایک ایسی شخصیت جس نے وقت، تجربہ، مشاہدہ اور احساس کو اپنے اندر سمیٹ کر خود کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کا سرورق اس کا چہرہ ہوتا ہے اور

اس کے صفحات اس کے دل کی دھڑکنیں، جو ہر قاری کے لمس سے ایک نئی لے میں دھڑکنے لگتی ہیں۔ ہر صفحہ ایک سانس لیتا ہوا لمحہ ہوتا ہے اور ہر جملہ ایک دھڑکن کی طرح قاری کے دل کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے، یوں کتاب اور قاری کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم ہوتا ہے جو محض مطالعہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک گہری رفاقت میں بدل جاتا ہے۔

قرآن مجید ہمیں تخلیق کے اس حسن اور توازن کی طرف متوجہ کرتا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ

اسی طرح کتاب بھی ایک بہترین ترتیب میں ڈھلا ہوا ایک فکری وجود ہوتی ہے، جس میں ظاہری ساخت اور باطنی معنی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک مکمل نظام تشکیل دیتے ہیں۔ اس تصور کی سب سے کامل مثال خود قرآن مجید ہے، جو ایک کتاب ہونے کے باوجود ایک زندہ اور بولتی ہوئی حقیقت ہے، جس کی ساخت اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہوئی اور جس کی ترتیب حضور نبی اکرم ﷺ کی نگرانی میں مکمل ہوئی۔ یوں یہ کتاب محض تحریر نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ رہنما بن جاتی ہے، جو ہر زمانے کے انسان سے بات کرتی ہے، اسے سنبھالتی ہے اور اس کے باطن کو روشن کرتی ہے۔ اسی معنی میں یہ سیرت النبی ﷺ کی پہلی اور بنیادی کتاب بھی بن جاتی ہے، جس میں زندگی کو صرف بیان نہیں کیا گیا بلکہ جینے کے لیے ایک زندہ نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا جسم صرف کاغذ اور سیاہی پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ یہ یادوں، تجربات اور جذبات کا ایک مرکب ہوتا ہے۔ اس کی جلد بندی اس کی مضبوطی ہے اور اس کے صفحات اس کے اعضاء، جو مل کر ایک مکمل وجود کو قائم رکھتے ہیں۔ جب قاری اسے کھولتا ہے تو گویا وہ اس کے اندر داخل ہوتا ہے، اس کے رازوں، خوابوں اور کہانیوں سے روبرو ہوتا ہے۔ ایک اچھی کتاب اپنے اندر صرف جواب نہیں رکھتی بلکہ سوال پیدا کرتی ہے، سوچ کو چیلنج کرتی ہے اور قاری کو اپنے مانے ہوئے سچ کو دوبارہ دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جہاں کتاب ایک خاموش استاد اور ایک مخلص ساتھی بن جاتی ہے، جو انسان کو اس کے باطن سے جوڑتی ہے اور اسے اپنے رب کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

وقت کے ساتھ یہ تعلق اور بھی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ جب قاری کتاب کو بار بار پڑھتا ہے تو وہ بھی قاری کو نئے انداز میں پڑھتی ہے، اس کے بدلتے ہوئے حالات اور تجربات کے مطابق اپنے معنی کو دوبارہ آشکار کرتی ہے۔ قرآن مجید اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے: وَنُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

ہم اپنی نشانیوں کو بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ غور کریں۔ یوں کتاب ایک جسم سے بڑھ کر ایک روحانی کائنات بن جاتی ہے، جہاں ہر صفحہ ایک جہان ہے، ہر لفظ ایک چراغ اور ہر مطالعہ ایک نیا

جنم، جس میں قاری خود کو دوبارہ دریافت کرتا ہے۔ جب قاری اس سطح تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے لیے کتاب صرف پڑھی جانے والی شے نہیں رہتی بلکہ ایک ایسا آئینہ بن جاتی ہے جس میں وہ اپنی حقیقت، اپنی منزل، اور اپنے رب کی طرف اپنے سفر کو پہچاننے لگتا ہے۔

حروف اور الفاظ

حروف اور الفاظ کی بھی اپنی ایک فطرت ہوتی ہے اور ایک ماہر قاری کے لیے ان دونوں کے درمیان تعلق محض لسانی نہیں بلکہ ایک زندہ اور بامعنی رشتہ بن جاتا ہے۔ حروف دراصل بنیاد ہوتے ہیں، خاموش اکائیاں، جو اپنی تنہائی میں محدود نظر آتی ہیں، مگر جب یہی حروف ایک خاص ترتیب میں جڑتے ہیں تو الفاظ جنم لیتے ہیں اور الفاظ معانی کی دنیا آباد کر دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر حرف کے اندر ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے، ایک ایسی کائنات جو بظاہر نظر نہیں آتی مگر غور کرنے والے پر کھلنے لگتی ہے۔ اگر آپ کسی حرف کو گہرائی سے دیکھیں، اس پر ٹھہریں، تو آپ کو اس کے اندر ایک زندگی دھڑکتی ہوئی محسوس ہو گی۔ یہی وہ راز ہے جسے ایک خطاط سب سے زیادہ سمجھتا ہے، وہ ہر حرف کی قدر، اس کے وزن، اس کے توازن اور اس کے اندر چھپی ہوئی کائنات کو پہچانتا ہے، اسی لیے خطاطی محض لکھنے کا عمل نہیں رہتی بلکہ فن اور تخلیق کی اعلیٰ ترین صورتوں میں شمار ہوتی ہے۔

ایک غیر تربیت یافتہ نظر صرف الفاظ کو پڑھتی ہے، لیکن ایک ہنر مند قاری حروف کی ترتیب، لفظ کے انتخاب اور اس کے پیچھے چھپی ہوئی نیت کو بھی محسوس کرتا ہے۔ پیشہ ورانہ سطح پر یہی شعور انسان کو باریکیوں تک لے جاتا ہے، جہاں وہ صرف مواد نہیں بلکہ اسلوب، زور، خاموشی اور تاثر کو بھی سمجھتا ہے اور یوں اس کی فہم گہری اور مؤثر ہو جاتی ہے۔ جبکہ روحانی سطح پر یہی حروف اور الفاظ نور کا ذریعہ بن جاتے ہیں، جہاں ایک لفظ دل کو چھو لیتا ہے، ایک جملہ انسان کو بدل دیتا ہے اور ایک آیت انسان کے اندر ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے: الٓرٰ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ

یعنی یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔ گویا حروف اور الفاظ جب الٰہی ترتیب میں ڈھلتے ہیں تو وہ محض زبان نہیں رہتے بلکہ ہدایت اور نور کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح حروف اور الفاظ کا یہ تعلق محض اظہار کا وسیلہ نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا دروازہ بن جاتا ہے جو ذہن کو وسعت دیتا ہے اور روح کو بیدار کرتا ہے، اور ایک ماہر قاری اسی راز کو پہچان کر مطالعے کو ایک بلند تر تجربہ بنا دیتا ہے۔

فونٹ: حروف کی ظاہری ساخت

فونٹ دراصل حروف کی ظاہری ساخت، ان کے خدوخال، اور ان کے پیش ہونے کے انداز کا نام ہے، مگر حقیقت میں یہ اس سے کہیں زیادہ گہرا مفہوم رکھتا ہے۔ یہ صرف ایک ڈیزائن نہیں بلکہ ایک احساس ہے، ایک لہجہ ہے، ایک خاموش زبان ہے جو قاری کے دل اور ذہن سے براہِ راست گفتگو کرتی ہے۔ جس طرح انسان کا لباس، اس کا اندازِ گفتگو، اور اس کی نشست و برخاست اس کی شخصیت کا پہلا تعارف بن جاتے ہیں، اسی طرح فونٹ بھی کسی متن کی پہلی پہچان ہوتا ہے۔ قاری جب کسی تحریر کو دیکھتا ہے تو اس کا تعلق صرف الفاظ سے نہیں بنتا بلکہ اس انداز سے بھی بنتا ہے جس میں وہ الفاظ اس کے سامنے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فونٹس پڑھنے والے کو اپنے اندر کھینچ لیتے ہیں، جبکہ کچھ اسے فاصلے پر رکھ دیتے ہیں۔ ایک سنجیدہ فونٹ متن کو وقار دیتا ہے، ایک نرم فونٹ اس میں لطافت پیدا کرتا ہے، اور ایک غیر متوازن فونٹ پورے پیغام کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس طرح فونٹ صرف خوبصورتی نہیں بلکہ معنی کی ترسیل کا ایک بنیادی ذریعہ بن جاتا ہے۔

ایک ماہر قاری کے نقطۂ نظر سے فونٹ کا مطالعہ بھی ایک شعوری عمل ہوتا ہے۔ وہ صرف یہ نہیں دیکھتا کہ کیا لکھا گیا ہے بلکہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اسے کیسے پیش کیا گیا ہے۔ پیشہ ورانہ سطح پر یہی باریکی انسان کو ایک عام قاری سے ممتاز کرتی ہے، کیونکہ وہ متن کے اسلوب، اس کی رفتار، اور اس کے تاثر کو فونٹ کے ذریعے بھی پڑھنے لگتا ہے۔ ایک اچھا فونٹ قاری کی آنکھ کو تھکنے نہیں دیتا، اس کی توجہ کو بکھرنے نہیں دیتا، بلکہ اسے ایک روانی کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے، جیسے کوئی ہموار راستہ جس پر چلنا آسان اور خوشگوار ہو۔ اسی لیے علم کی دنیا میں، تحقیق میں، اور پیشہ ورانہ تحریروں میں فونٹ کا انتخاب ایک سنجیدہ فیصلہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ قاری کے تجربے کو تشکیل دیتا ہے۔ یوں فونٹ صرف حروف کی صورت نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا وسیلہ بن جاتا ہے جو پیغام کی طاقت، اس کی سنجیدگی، اور اس کے اثر کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

روحانی سطح پر اگر ہم فونٹ کو دیکھیں تو یہ ہمیں ایک اور گہری حقیقت کی طرف لے جاتا ہے۔ جس طرح کائنات کی ہر شے ایک خاص توازن، حسن اور تناسب کے ساتھ تخلیق کی گئی ہے، اسی طرح حروف کی ساخت میں بھی ایک نظم اور جمال پوشیدہ ہے۔ قرآن مجید ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے: الَّذِی خَلَقَ فَسَوّٰی

یعنی وہ ذات جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اسے ایک کامل توازن میں ڈھال دیا۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ

یعنی یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو کمال کے ساتھ بنایا۔

جب ہم فونٹ کو اس زاویے سے دیکھتے ہیں تو یہ محض ڈیزائن نہیں رہتا بلکہ ایک جھلک بن جاتا ہے اس الٰہی حسن کی، جو ترتیب، تناسب اور توازن میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہر حرف اپنی جگہ پر ایک وزن رکھتا ہے، ایک خاموش حسن رکھتا ہے اور جب یہ سب مل کر ایک مکمل صورت اختیار کرتے ہیں تو ایک ایسا جمال پیدا ہوتا ہے جو آنکھ سے ہوتا ہوا دل تک اتر جاتا ہے۔

جملہ کیا ہے؟

جملہ بظاہر چند الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتا ہے، مگر ایک قاری کے نقطۂ نظر سے یہ محض الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ ایک مکمل معنی کا سانس لیتا ہوا اظہار ہوتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں خیال شکل اختیار کرتا ہے، احساس زبان پاتا ہے، اور فکر ایک واضح صورت میں سامنے آتی ہے۔ ایک عام قاری جملے کو پڑھ کر آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن ایک ہنر مند قاری اس میں ٹھہرتا ہے، اس کے اندر جھانکتا ہے اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس جملے کے پیچھے کون سا جذبہ، کون سی نیت اور کون سا شعور کارفرما ہے۔ جب کوئی جملہ ذہن اور دل دونوں کی طاقت سے لکھا جاتا ہے تو وہ صرف معلومات نہیں دیتا بلکہ اثر پیدا کرتا ہے، وہ قاری کے اندر اتر جاتا ہے، اس کی سوچ کو چھیڑتا ہے اور اس کے احساس کو بیدار کرتا ہے۔ ایسا جملہ محض پڑھا نہیں جاتا بلکہ محسوس کیا جاتا ہے، جیا جاتا ہے اور بعض اوقات انسان کی زندگی کا رخ بھی بدل دیتا ہے۔

قرآن مجید ہمیں جملے کی اسی قوت کا شعور دلاتا ہے جب وہ فرماتا ہے:

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ

یعنی پاکیزہ کلمات اسی کی طرف بلند ہوتے ہیں۔

گویا ایک جملہ بھی روحانی قدر رکھتا ہے اور اپنے اثر کے ساتھ بلند ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، یعنی لوگوں سے اچھی بات کہو۔

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جملہ صرف اظہار نہیں بلکہ اخلاق اور کردار کا آئینہ بھی ہے۔

احادیث میں بھی جملے کی یہی تاثیر نمایاں ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

انسان ایک بات کہتا ہے اور اس کے ذریعے بلند درجات پالیتا ہے اور کبھی ایک بات ایسی کہہ دیتا ہے جو اسے گرا دیتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: جس کا ایمان اللہ اور آخرت پر ہو وہ یا تو اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔

یہ تمام مثالیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ جملہ محض زبان سے نکلنے والی آواز نہیں بلکہ ایک ذمہ داری ہے، ایک امانت ہے اور ایک اثر ہے جو انسان کی شخصیت کو تشکیل دیتا ہے۔

پیرا گراف کیا ہے؟

پیرا گراف دراصل محض جملوں کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ ایک مکمل فکری اکائی ہوتا ہے، ایک ایسا زندہ حصہ جس کے اندر ایک خیال جنم لیتا ہے، پروان چڑھتا ہے اور اپنی تکمیل تک پہنچتا ہے۔ یہ تحریر کے جسم میں ایک سانس لیتا ہوا عضو ہوتا ہے، جہاں ہر جملہ دوسرے جملے سے جڑا ہوتا ہے اور مل کر ایک واضح اور مربوط معنی پیدا کرتا ہے۔ بظاہر قاری کے لیے یہ صرف چند سطریں معلوم ہوتی ہیں، مگر حقیقت میں یہ ایک منظم سفر ہوتا ہے جس کی اپنی ابتدا، درمیان اور انجام ہوتا ہے۔ ایک ہنر مند قاری جانتا ہے کہ پیرا گراف کو کیسے پڑھنا ہے، وہ ہر جملے کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ دیکھتا ہے، وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ تمام جملے مل کر کون سا مرکزی خیال پیش کر رہے ہیں اور اس خیال کی سمت کیا ہے؟ اسی لیے پیرا گراف قاری کے لیے ایک نقشہ بن جاتا ہے، جو اسے مصنف کے ذہن کے اندر لے جاتا ہے اور اسے اس فکری راستے پر چلنا سکھاتا ہے جو تحریر کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔

پیشہ ورانہ سطح پر پیرا گراف کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے، کیونکہ یہی وہ اکائی ہے جہاں خیال کو ترتیب دی جاتی ہے، دلیل کو مضبوط بنایا جاتا ہے، اور پیغام کو واضح کیا جاتا ہے۔ ایک مضبوط پیرا گراف قاری کو الجھن میں نہیں ڈالتا بلکہ اسے ایک واضح راستہ دیتا ہے، جہاں ہر جملہ اپنے مقام پر معنی خیز ہوتا ہے اور مجموعی طور پر ایک مکمل تصویر بناتا ہے۔ اگر پیرا گراف میں ربط نہ ہو، تسلسل نہ ہو، تو قاری کا ذہن منتشر ہو جاتا ہے، اور پیغام اپنی تاثیر کھو دیتا ہے۔ اس کے برعکس، جب پیرا گراف منظم، مربوط اور متوازن ہوتا ہے تو یہ قاری کے ذہن کو بھی اسی ترتیب میں لے آتا ہے، اسے سوچنے کا ایک سلیقہ دیتا ہے اور اسے یہ سکھاتا ہے کہ خیالات کو کیسے ترتیب دیا جائے۔ یوں پیرا گراف صرف لکھنے کا حصہ نہیں رہتا بلکہ سوچنے کا ایک طریقہ بن جاتا ہے۔

روحانی سطح پر پیرا گراف ایک اور ہی معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ہمیں اس حقیقت کی طرف لے جاتا ہے کہ جیسے کائنات میں ہر چیز ایک نظم اور ترتیب کے ساتھ قائم ہے، ویسے ہی

فکر بھی ایک نظم چاہتی ہے، ایک توازن چاہتی ہے۔ قرآن مجید ہمیں اس طرف یوں متوجہ کرتا ہے: کِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ

یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو مضبوط اور مربوط بنایا گیا ہے۔ گویا الٰہی کلام بھی ایک منظم ترتیب میں ہے، جہاں ہر آیت اپنی جگہ پر مکمل ہے اور پھر بھی ایک بڑے پیغام کا حصہ ہے۔ اسی طرح ایک پیرا گراف بھی اپنے اندر مکمل ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ایک وسیع تر خیال سے جڑا ہوتا ہے۔ جب قاری اس نظم اور ربط کو محسوس کرنے لگتا ہے تو اس کے لیے مطالعہ صرف الفاظ کو سمجھنا نہیں رہتا بلکہ ایک ایسی ترتیب کو پہچاننا بن جاتا ہے جو اس کے اپنے اندر بھی ایک توازن پیدا کرتی ہے۔ یوں پیرا گراف ایک آئینہ بن جاتا ہے، جہاں قاری نہ صرف تحریر کو سمجھتا ہے بلکہ اپنے سوچنے کے انداز کو بھی ترتیب دیتا ہے اور یہی ترتیب اسے ذہنی وضاحت اور روحانی سکون کی طرف لے جاتی ہے۔

لائنوں کے درمیان وقفہ

لائنوں کے درمیان وقفہ بظاہر ایک خالی جگہ معلوم ہوتا ہے، مگر ایک حساس اور باشعور قاری کے لیے یہ خاموشی بھی ایک زبان رکھتی ہے، ایک ایسا اظہار جو الفاظ کے بغیر بھی بہت کچھ کہہ دیتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں تحریر سانس لیتی ہے، جہاں قاری کو ٹھہرنے کا موقع ملتا ہے، جہاں آنکھ کو سکون اور ذہن کو ترتیب نصیب ہوتی ہے۔ اگر الفاظ ایک تسلسل میں بغیر وقفے کے بہتے رہیں تو وہ بوجھ بن جاتے ہیں، قاری تھک جاتا ہے، اور معنی دھندلا جاتے ہیں۔ لیکن جب لائنوں کے درمیان مناسب فاصلہ ہوتا ہے تو وہ تحریر کو وسعت دیتا ہے، اسے پھیلاؤ دیتا ہے، اور ہر جملے کو اپنی مکمل موجودگی کے ساتھ سامنے آنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یوں یہ وقفہ محض خالی جگہ نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا خاموش عنصر بن جاتا ہے جو مطالعے کے تجربے کو متوازن اور خوشگوار بناتا ہے۔

ایک ماہر قاری اس وقفے کو بھی پڑھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ کہاں ٹھہرنا ہے، کہاں سانس لینا ہے، اور کہاں اگلے خیال کی طرف بڑھنا ہے۔ پیشہ ورانہ سطح پر یہی وقفہ تحریر کی روانی کو متعین کرتا ہے، اس کی رفتار کو کنٹرول کرتا ہے، اور قاری کی توجہ کو برقرار رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا غیر مرئی ڈھانچہ ہے جو پوری تحریر کو سہارا دیتا ہے، جیسے کسی عمارت میں وہ خلا جو دیواروں کے درمیان ہوتا ہے اور جس کے بغیر نہ روشنی داخل ہو سکتی ہے اور نہ ہوا۔ اگر وقفہ بہت کم ہو تو تحریر گھٹن پیدا کرتی ہے، اور اگر بہت زیادہ ہو تو تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے ایک متوازن وقفہ تحریر کو نہ صرف خوبصورت بناتا ہے بلکہ اسے قابلِ فہم اور مؤثر بھی بناتا ہے۔ یوں لائنوں کے درمیان فاصلہ قاری کے ذہن میں ایک ترتیب پیدا کرتا ہے،

اسے ایک خاموش رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ وہ متن کے ساتھ کیسے آگے بڑھے۔

روحانی سطح پر یہی وقفہ ہمیں ایک اور گہری حقیقت کی طرف لے جاتا ہے، وہ حقیقت کہ خاموشی بھی ایک پیغام رکھتی ہے، اور خلا بھی ایک معنی رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا فُرْجًا

یعنی ہم نے ان کے درمیان کشادگی اور فاصلے رکھے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توازن اور ترتیب میں خلا کا بھی اپنا کردار ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں جابجا غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ غور اکثر اسی وقفے میں پیدا ہوتا ہے، اسی خاموش لمحے میں جہاں قاری الفاظ سے آگے بڑھ کر معنی تک پہنچتا ہے۔ یوں لائنوں کے درمیان یہ فاصلہ ایک روحانی توقف بن جاتا ہے، ایک ایسا لمحہ جہاں قاری صرف پڑھتا نہیں بلکہ سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے اور اپنے اندر اترتا ہے۔

صفحہ کیا ہے؟

صفحہ بظاہر کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے، ایک محدود سطح جس پر الفاظ ترتیب دیے جاتے ہیں، مگر ایک باشعور قاری کے لیے صفحہ محض جگہ نہیں بلکہ ایک مکمل جہان ہوتا ہے۔ یہ وہ میدان ہے جہاں خیالات اترتے ہیں، جہاں الفاظ اپنی جگہ پاتے ہیں، اور جہاں ایک خاموش مکالمہ قاری اور مصنف کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ جب قاری کسی صفحے کو دیکھتا ہے تو وہ صرف جملے نہیں پڑھتا بلکہ ترتیب، خالی جگہ، سطروں کی روانی اور مجموعی ساخت کو بھی محسوس کرتا ہے۔ ہر صفحہ اپنے اندر ایک خاص کیفیت رکھتا ہے، ایک خاص رفتار، ایک خاص تاثر۔ بعض صفحات قاری کو روک لیتے ہیں، اس سے مکالمہ کرتے ہیں اور بعض اسے آگے بڑھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یوں صفحہ ایک زندہ لمحہ بن جاتا ہے، ایک ایسا لمحہ جس میں فکر سانس لیتی ہے اور معنی اپنی مکمل موجودگی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

بطور ایک مستقل اکائی، ہر صفحہ اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ یہ ایک مکمل خیال کو اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے، ایک سوال اٹھا سکتا ہے، یا ایک احساس کو جنم دے سکتا ہے۔ اگر کتاب ایک مسلسل اور بے ترتیب بہاؤ ہو تو قاری کے لیے اسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے، مگر صفحات کی تقسیم اس بہاؤ کو منظم کرتی ہے، اسے قابلِ فہم بناتی ہے اور ہر حصے کو اس کا حق دیتی ہے۔ یوں صفحہ ایک ایسا مقام بن جاتا ہے جہاں قاری رک کر اپنے فہم کو ترتیب دے سکتا ہے۔

لیکن جب ہم صفحہ کو پوری کتاب کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو اس کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جیسے انسانی جسم میں ہر عضو اپنی جگہ اہم ہوتا ہے مگر اپنی اصل قدر تب پاتا ہے جب وہ پورے جسم کے

ساتھ جڑا ہوتا ہے، ویسے ہی صفحہ بھی کتاب کے مجموعی وجود کا حصہ بن کر اپنی مکمل تاثیر دکھاتا ہے۔ ایک صفحہ اکیلا ایک خیال پیش کر سکتا ہے، مگر جب وہ دوسرے صفحات کے ساتھ جڑتا ہے تو ایک مکمل داستان، ایک مکمل فکر اور ایک مربوط پیغام تشکیل پاتا ہے۔

کتاب کے اندر خالی صفحہ

کتاب کے اندر خالی صفحہ بظاہر ایک بے معنی خلا محسوس ہوتا ہے، ایک ایسی جگہ جہاں کچھ لکھا نہیں گیا، جہاں الفاظ موجود نہیں، اور جہاں نظر کو کوئی گرفت نہیں ملتی۔ مگر ایک باشعور قاری کے لیے یہی خالی صفحہ سب سے زیادہ بامعنی ہو سکتا ہے۔ یہ خاموشی کا وہ مقام ہے جہاں تحریر رک جاتی ہے مگر معنی جاری رہتے ہیں، جہاں مصنف بولنا چھوڑ دیتا ہے مگر قاری سوچنا شروع کرتا ہے۔ خالی صفحہ دراصل ایک دعوت ہوتا ہے، ایک ایسا دروازہ جو قاری کو خود اپنے اندر داخل ہونے کا موقع دیتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں کتاب اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتی ہے اور قاری کو آزادی دیتی ہے کہ وہ اپنے سوالات، اپنے احساسات اور اپنے تجربات کو اس خلا میں رکھے۔ اسی لیے خالی صفحہ صرف عدم موجودگی نہیں بلکہ ایک پوشیدہ موجودگی ہے، ایک ایسا امکان جو ابھی لکھا جانا باقی ہے۔

مزید گہرائی میں دیکھا جائے تو خالی صفحہ کتاب کے جمالیاتی حسن اور ساختی نظم کا بھی ایک لازمی حصہ ہوتا ہے۔ یہ محض خلا نہیں بلکہ ڈیزائن کا ایک شعوری انتخاب ہوتا ہے، ایک ایسا وقفہ جو پوری کتاب کی ساخت کو توازن دیتا ہے، اس کے بہاؤ کو ترتیب دیتا ہے اور قاری کے ذہن کو ایک مہذب انداز میں اگلے مرحلے کے لیے تیار کرتا ہے۔ جیسے ایک خوبصورت عمارت میں خالی جگہیں روشنی اور ہوا کے لیے ضروری ہوتی ہیں، ویسے ہی کتاب میں خالی صفحہ آنکھ کو سکون دیتا ہے، ذہن کو بوجھ سے بچاتا ہے اور مطالعہ کو ایک باوقار اور منظم تجربہ بناتا ہے۔ یہ ساختی نظم دراصل ایک خاموش تربیت ہے، جو قاری کو سکھاتی ہے کہ خوبصورتی صرف بھر دینے میں نہیں بلکہ مناسب خالی جگہ چھوڑنے میں بھی ہوتی ہے۔

روحانی سطح پر یہی خالی پن ہمیں اس حقیقت کی طرف لے جاتا ہے کہ خاموشی بھی ایک زبان رکھتی ہے اور خلا بھی ایک معنی رکھتا ہے۔ قرآن مجید ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور یہ غور اکثر اسی خالی جگہ میں جنم لیتا ہے جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں اور شعور جاگ اٹھتا ہے۔ یوں کتاب کے اندر خالی صفحہ ایک آئینہ بن جاتا ہے، جس میں قاری اپنی ہی سوچ، اپنی ہی کیفیت اور اپنے ہی سفر کو دیکھنے لگتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں مطالعہ ایک طرفہ عمل نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ مکالمہ بن جاتا ہے، جس میں لکھا ہوا بھی بولتا ہے اور نہ لکھا ہوا بھی کلام کرتا ہے۔

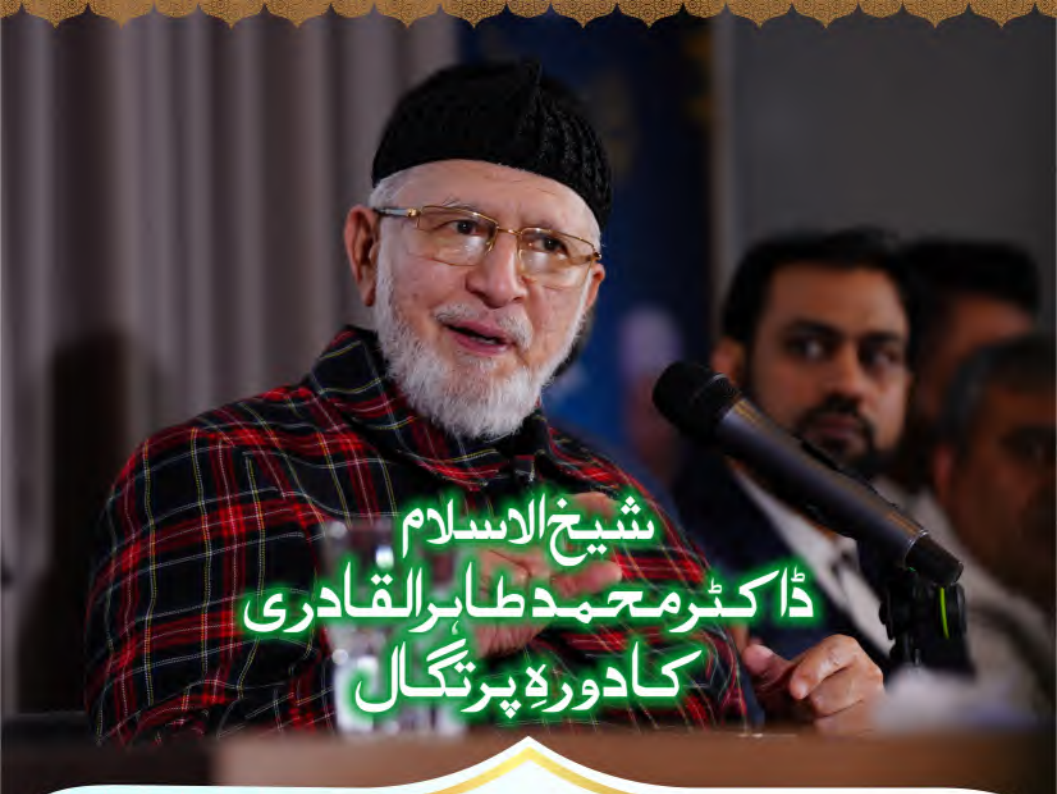

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا دورۂ پرتگال

گزشتہ ماہ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے چیئرمین سپریم کونسل MQI ڈاکٹر حسن محی الدین قادری اور یورپ کے دیگر رہنماؤں کے ہمراہ پرتگال کے دارالحکومت لزبن کا ایک تاریخی دورہ کیا، جس میں انہوں نے مختلف پروگرامز، تربیتی نشستوں اور بین الاقوامی کانفرنسز سے خطاب کرتے ہوئے امن، رواداری اور نئی نسل کی تربیت کا جامع منشور پیش کیا۔ اس دورہ کی اجمالی رپورٹ نذرِ قارئین ہے:

۱۔ مرکزی اسلامک سنٹر لزبن میں منعقدہ "سیرت النبی ﷺ و امنِ عالم کانفرنس" سے خطاب کرتے ہوئے شیخ الاسلام نے سیرتِ طیبہ کو انسانیت کے لیے کامل ضابطہ حیات قرار دیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ انتہا پسندی اور عدم برداشت کا واحد حل تعلیماتِ نبوی ﷺ میں مضمر ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کے لیے امن، عدل، محبت اور برداشت کا آفاقی پیغام رکھتی ہے۔ اگر ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کو عملی طور پر نافذ کر لیں تو دنیا حقیقی معنوں میں امن و سلامتی کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ انسان کی زندگی صرف مادی ترقی تک محدود نہیں بلکہ اس کی حقیقی کامیابی روحانی بالیدگی، اعلیٰ اخلاق اور انسانی اقدار کی پاسداری میں ہے، اور یہ تمام اوصاف ہمیں سیرتِ رسول اکرم ﷺ سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔

کانفرنس میں بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے سکھ کمیونٹی کے رہنماؤں، عیسائی اور دیگر کمیونٹیز کے نمائندگان سمیت مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے بھرپور شرکت کی۔

۲۔ لزبن کے مقامی ہال میں منعقدہ "میٹ اینڈ گریٹ سیشن" میں مسلم و غیر مسلم اور پاکستانی کمیونٹی نے بھرپور شرکت کی۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے اپنے خطاب میں انسانی زندگی کے حقیقی مقصد، روحانی تربیت اور دین سے مضبوط تعلق کی اہمیت کو نہایت جامع انداز میں اجاگر کیا۔ انہوں نے کہا کہ انسانی زندگی محض مادی ضروریات تک محدود نہیں بلکہ اس کا ایک گہرا روحانی پہلو بھی ہے، جس کی تکمیل ذکرِ الٰہی، عبادات اور دین کی درست معرفت سے ممکن ہے۔ انہوں نے بچوں کی ابتدائی تربیت کو بنیاد قرار دیتے ہوئے والدین پر زور دیا کہ وہ اپنی اولاد کی دینی و اخلاقی تربیت پر خصوصی توجہ دیں اور خود بہترین عملی نمونہ پیش کریں۔

انہوں نے واضح کیا کہ ماحول اور معاشرت انسان کی شخصیت سازی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، اس لیے نوجوان نسل کو مساجد اور دینی مراکز سے وابستہ رکھنا ناگزیر ہے۔ قرآن مجید کو ''فرقان'' کے طور پر سمجھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہی حق و باطل میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے اس امر کو بھی نمایاں کیا کہ مسجد صرف عبادت کا مقام نہیں بلکہ ایک مؤثر تربیتی مرکز ہے، اور دین کی بقاو فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد، محنت اور استقامت بنیادی تقاضے ہیں۔

نشست کے دوران سوال و جواب کا سیشن بھی منعقد ہوا، جس میں شرکاء نے اسلام، دیارِ غیر میں بسنے والے مسلمانوں کو درپیش مسائل، پاکستانی کمیونٹی کے چیلنجز، معاشرتی عدم استحکام اور امتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود جیسے اہم موضوعات پر سوالات کیے۔

تقریبات میں چیئرمین سپریم کونسل ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، بلال اُپل، محمد صغیر، کاشف نذیر، سکھ کمیونٹی کے صدر گگندیپ سنگھ، محمد رفیق (مرکزی مسجد لزبن)، محمد یاسین (کیپٹل ہوٹل)، خالد جمال، مبین سید فیصل، پرتگالی و موزمبیق سفارتی حکام، پاکستانی سفارتخانے کے کونسلر آفیسر محمد اکرام، پاسپورٹ آفیسر غلام مصطفیٰ، باتسہ بانو، عمادے موسیٰ، موزمبیق کے سفیر اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کی ممتاز شخصیات بشمول حسن بوستان، مرینہ شاہ سید، عامر صدیق اور دیگر نے شرکت کی۔

۳۔ شیخ الاسلام نے لزبن کے مقامی ہوٹل میں منہاج القرآن ویمن لیگ کی ذمہ داران و کارکنان سے خطاب کرتے ہوئے بچوں کی تربیت اور خاندانی نظام پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ شیخ الاسلام نے ماں کے عظیم مقام اور اس کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ انسان کی زندگی کا آغاز ماں کے پیٹ سے ہوتا

ہے، جہاں بچہ نو ماہ تک ماں کے وجود کا حصہ رہتا ہے۔ اس دوران ماں کی جسمانی اور ذہنی کیفیت براہِ راست بچے کی نشوونما اور شخصیت پر اثرانداز ہوتی ہے۔ سائنسی تحقیقات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ ماں کی خوشی، سکون اور ذہنی حالت بچے کے مزاج اور مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اسلام نے ماں کے مقام کو بے حد بلند رکھا ہے، یہاں تک کہ ''ماں کے قدموں تلے جنت ہے'' کا تصور دراصل اس عظیم ذمہ داری اور قربانی کی عکاسی کرتا ہے جو ماں اپنے بچے کی پرورش میں ادا کرتی ہے۔ ماں نہ صرف بچے کو جنم دیتی ہے بلکہ اس کی ابتدائی تربیت، عادات اور شخصیت کی بنیاد بھی رکھتی ہے۔ انہوں نے والد کے کردار کو بھی نہایت اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ بچوں کی متوازن شخصیت کی تشکیل کے لیے باپ کی فعال شرکت ضروری ہے۔ اگر باپ بچوں کو وقت دے، ان کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرے اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلق قائم کرے تو بچے کی شخصیت زیادہ پُراعتماد اور متوازن بنتی ہے۔ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ محبت، توجہ اور مثبت ماحول فراہم کریں۔ شیخ الاسلام نے زور دیا کہ بچوں کی تربیت میں سختی، بدزبانی، غصہ اور گالی گلوچ جیسے رویے نہایت نقصان دہ ہیں۔ اسلام ہمیں حسنِ اخلاق، نرمی اور محبت کا درس دیتا ہے، اور یہی اصول بچوں کی تربیت میں اختیار کیے جانے چاہئیں۔

اگر گھر کا ماحول محبت، احترام اور سکون پر مبنی ہو تو بچے مثبت شخصیت کے حامل بنتے ہیں، جبکہ جھگڑے اور بے ادبی بچوں پر منفی اثرات چھوڑتے ہیں۔ دین کو صرف ظاہری عبادات تک محدود رکھنے کے بجائے اسے روزمرہ زندگی، گفتگو، رویے اور اخلاق کا حصہ بنانے کی تلقین کی گئی۔

انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ بچوں کے سوالات کو دبایا نہ جائے بلکہ انہیں کھل کر سوال کرنے کی ترغیب دی جائے۔ بچوں کی جستجو کو سراہتے ہوئے والدین کو ہدایت دی گئی کہ وہ صبر اور محبت کے ساتھ ان کے سوالات کے جوابات دیں تاکہ بچے دین کو سمجھ کر اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔ خصوصی طور پر خواتین (ماؤں) کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ وہ اپنی ذات میں دینی شعور پیدا کریں، اپنے کردار اور عمل کو بہتر بنائیں، اور محبت و حکمت کے ساتھ بچوں کی تربیت کریں۔ کیونکہ ماں ہی وہ پہلی درسگاہ ہے جہاں سے بچے کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔

آخر میں شرکاء کو تلقین کی گئی کہ دین کو اپنی زندگی، گھر کے ماحول اور خاندانی نظام کا حصہ بنائیں، صبر و حکمت کو اپنائیں، اور بچوں کی تربیت کو محبت، سمجھ اور مثبت انداز کے ساتھ انجام دیں تاکہ آنے والی نسلیں ایک مضبوط، متوازن اور حقیقی اسلامی کردار کے ساتھ پروان چڑھ سکیں۔

۴۔ شیخ الاسلام نے منہاج القرآن پر تگال کے ذمہ داران کے ساتھ خصوصی نشست میں روحانی تربیت، تزکیۂ نفس اور دین سے حقیقی وابستگی پر اثرانگیز گفتگو کی۔ آپ نے تحریک کے ابتدائی ایام کے

واقعات سنا کر رفقاء کے جذبوں کو مہمیز کیا اور اخلاص کے ساتھ مشن جاری رکھنے کی تلقین کی۔

منہاج القرآن انٹرنیشنل پرتگال کی مثالی تنظیمی کارکردگی کے اعتراف میں شیخ الاسلام اور ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے ایگزیکٹو کونسل کو خصوصی شیلڈ سے نوازا۔ یہ شیلڈ منہاج یورپین کونسل کی طرف سے دی گئی۔ اس موقع پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے منہاج القرآن پرتگال کی ایگزیکٹو ٹیم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اخلاص، نظم وضبط اور مسلسل محنت ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہیں۔ انہوں نے منہاج القرآن پرتگال کی تنظیمی خدمات کو قابلِ تقلید قرار دیتے ہوئے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ یورپ میں تنظیم کے کارکنان دینِ اسلام کے پیغام کو محنت، لگن اور ذمہ داری کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں۔ شیخ الاسلام نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس مشن کو مزید فروغ عطا فرمائے اور کارکنان کو استقامت اور اخلاص کے ساتھ خدمتِ دین جاری رکھنے کی توفیق دے۔ انہوں نے شرکاء کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ نیتوں کی پاکیزگی، باہمی اتحاد اور خدمتِ دین کو اپنی زندگیوں کا محور بنایا جائے تاکہ تنظیمی مقاصد مزید مؤثر انداز میں حاصل کیے جا سکیں۔

ان تمام نشستوں میں حسن بوستان، مرینہ شاہ سید، عامر صادق، قیصر زبیر نجیب، محمد ظل حسن، علامہ مفتی اعجاز ملک، شاہد مرسلین، حافظ غلام دستگیر، اظہر اعوان، قاری امجد محمود، حافظ امجد، غضنفر نذیر، بابر مغل، سفیان یوسف، قاسم نظیر، شاہد ملک، شمسہ نور، محسن لقمان، عمر شیخ، ڈاکٹر سہیل احمد، سمیرا اسلم، ثمرہ قاسم اور حفظہ سید اور یورپ بھر سے آئے ہوئے تنظیمی عہدیداران نے شرکت کی۔

Belt

منہاج القرآن انٹرنیشنل کے فاؤنڈنگ ممبرز ڈے کے موقع پر باوقار تقریب کا انعقاد

کونسل آف فاؤنڈنگ اینڈ سینئر ممبرز منہاج القرآن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام فاؤنڈنگ ممبرز ڈے کے موقع پر گذشتہ ماہ مرکزی سیکرٹریٹ ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک پُروقار خصوصی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ ہر سال یہ دن شیخ الاسلام کے اوائل دور، خصوصاً 1980ء کی دہائی میں تحریک منہاج القرآن سے وابستہ ہونے والے اُن رفقاء کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں منایا جاتا ہے جنہوں نے پاکستان سمیت دنیا بھر میں اس عظیم مصطفوی مشن کی آبیاری، اداروں کے قیام اور اُن کے استحکام میں شیخ الاسلام کے شانہ بشانہ نمایاں کردار ادا کیا۔ مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی تحاریک میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ تحریک کے بانیان کو یاد رکھا جائے اور انہیں ہر سال خراجِ تحسین پیش کرنے کی روایت قائم کی جائے۔ ایسی روایات سے احسان، شکر گزاری اور وفا کا کلچر فروغ پاتا ہے۔

☆ نائب ناظمِ اعلیٰ کوآرڈینیشن محترم ڈاکٹر محمد رفیق نجم نے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ اس تقریب کا بنیادی مقصد اُن مکرم و محتشم فاؤنڈنگ ممبرز اور رفقاء کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے، جنہوں نے 17 اکتوبر 1980ء سے تحریک منہاج القرآن کے آغاز کے ساتھ ہی شیخ الاسلام کے شانہ

بشانہ اس عظیم مصطفوی مشن کی آبیاری میں اپنا وقت، صلاحیتیں اور وسائل صرف کیے۔ آج تحریک منہاج القرآن کا دنیا کے 100 سے زائد ممالک میں پھیلاؤ اور اس کا تناور اور سایہ دار درخت بن جانا، آپ معززین کی اخلاص، محنت اور قربانیوں کا روشن ثبوت ہے۔ آپ میں سے ہر شخص فقط ایک فرد نہیں بلکہ ایک عہد اور ایک تاریخ کی نمائندگی کرتا ہے، جنہوں نے اپنی جوانی، وقت، وسائل اور سماجی مقام کو دین کے اس عظیم مشن کے لیے وقف کیا۔

☆ سیکرٹری کونسل آف فاؤنڈنگ ممبرز محترم شہزاد رسول قادری نے کہا کہ ابتدائی دور کے وہ ساتھی جنہوں نے نہ دن دیکھا نہ رات دیکھی اور ہر مشکل اور آزمائش کے وقت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے شانہ بشانہ کھڑے رہے، آج کا یہ عظیم دن درحقیقت اُن جانثار رفقاء کو سلامِ عقیدت پیش کرنے کا دن ہے۔ ہم اُن تمام فاؤنڈنگ اور سینئر ممبرز کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جنہوں نے اس عظیم مصطفوی مشن کی بنیادوں میں اپنا خونِ جگر، وقت اور صلاحیتیں صرف کیں۔ آج تحریک منہاج القرآن کا دنیا بھر میں پھیلاؤ اُنہی بزرگوں کی اخلاص، قربانیوں اور استقامت کا نتیجہ ہے۔ آپ سب ہمارے لیے موٹیویشن اور رہنمائی کا سرچشمہ ہیں۔ ہم آپ کی محبت، اخلاص اور قربانیوں سے سبق لیتے ہیں۔آپ اپنی قیمتی نصیحتوں اور تجربات سے ہماری رہنمائی فرماتے رہا کریں تاکہ ہم اس عظیم مشن کو آئندہ نسلوں تک اسی جذبے اور اخلاص کے ساتھ منتقل کر سکیں۔

☆ محترم علامہ شاہد لطیف قادری (صدر منہاجینز، ڈائریکٹر ریسورسز اینڈ ڈویلپمنٹ) نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی شخصیت اور اُن کی خدمات ایسی ہیں کہ آنے والی نسلیں بھی اُن کا تذکرہ فخر کے ساتھ کریں گی، اور جو شخص اُن کے دور کو دیکھنے یا اُن سے نسبت رکھنے کا دعویٰ کرے گا، لوگ اُسے خوش نصیب اور صاحبِ سعادت سمجھیں گے۔ تحریک منہاج القرآن کے فاؤنڈنگ اور سینئر ممبرز وہ خوش نصیب افراد ہیں جنہوں نے شیخ الاسلام کی جوانی کے دور میں اُن کے ساتھ سفر کیے، مشکلات برداشت کیں اور اس عظیم مصطفوی مشن کی آبیاری میں اپنا کردار ادا کیا۔آپ رفقاء کی قربانیاں اور استقامت اس تحریک کا حقیقی سرمایہ ہیں۔

شیخ الاسلام کی سب سے بڑی شفقت اور بصیرت یہ ہے کہ انہوں نے آنے والی نسلوں کی تربیت کے لیے پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری اور پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کی صورت میں ایسی قیادت تیار کی گئی ہے جو نہ صرف اس مشن کو آگے بڑھا رہی ہے بلکہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام کے پیغام کو دنیا بھر میں مؤثر انداز میں پہنچا رہی ہے۔ تحریک منہاج القرآن کی اصل

طاقت عمارات یا وسائل نہیں بلکہ وہ افراد ہیں جو اخلاص، محبت اور خدمت کے جذبے کے ساتھ اس مشن سے وابستہ ہیں۔

☆ اس تقریب میں سینئر ممبران نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اگر کسی دور میں ایمان کے تحفظ اور دین کی خدمت کرنے والی کوئی جماعت موجود ہو تو اُس کے ساتھ شامل ہو جانا ہی ایمان کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اس تحریک کے آغاز سے ہی اس کے ساتھ وابستہ ہوئے اور الحمد للہ تعالیٰ آج تک اس کے ساتھ تعلق کو اپنا اعزاز سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عظیم مشن سے وابستہ کر کے بے پناہ سعادت عطا فرمائی ہے۔ شیخ الاسلام کی شخصیت نے انہیں اس بات کا یقین دلایا کہ دین کی خدمت علم، اخلاص اور استقامت کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ تحریک منہاج القرآن کے ابتدائی ایام میں کارکنان نے بے شمار مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کیا، مگر شیخ الاسلام کی قیادت اور حوصلہ افزائی نے انہیں ثابت قدم رکھا۔ ان ایام میں دین کی خدمت کا جذبہ اور اتحاد ہی اصل طاقت تھا، جس نے اس تحریک کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم مشن کے ساتھ اخلاص اور استقامت کے ساتھ وابستہ رکھے اور ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم اس روحانی امانت کو آئندہ نسلوں تک صحیح انداز میں منتقل کر سکیں۔

☆ صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے فاؤنڈنگ ممبرز ڈے کی تقریب میں نہایت فکر انگیز خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی بھی نیک مشن کے آغاز میں شامل ہونا محض ایک تنظیمی وابستگی نہیں بلکہ ایک ایسی سعادت ہے جو انسان کو اُس مشن کی تاریخ کا حصہ بنا دیتی ہے۔ آج جو آسانیاں، وسعتیں اور ثمرات دکھائی دیتے ہیں، وہ دراصل انہی لوگوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہیں جنہوں نے ابتدا میں خاموشی، استقامت اور یقین کے ساتھ اس چراغ کو روشن رکھا۔ اولین افراد کا مقام ہمیشہ منفرد ہوتا ہے۔ بعد میں آنے والے افراد یقیناً بڑی خدمات انجام دیتے ہیں، ادارے قائم کرتے ہیں، علمی و دعوتی کاموں کو فروغ دیتے ہیں مگر "ابتدا" کا شرف صرف انہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے جنہوں نے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے یقین کیا اور ظاہری کامیابیوں کے بغیر اخلاص، اعتماد اور وفاداری کے ساتھ ایک مشن کا ہاتھ تھاما۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اسلام میں کسی نیک عمل کا اجراء کرتا ہے، پھر بعد میں لوگ اس پر عمل کریں، تو اس کے لیے ان سب کے برابر اجر لکھا

جاتا ہے ، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی کی جائے۔ یہ ایسا عظیم اجر ہے جس کا تسلسل وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور قیامت تک ملتا رہے گا۔ یہ اصول صرف دینی روایت تک محدود نہیں بلکہ تاریخِ انسانی میں بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ بغداد کی علمی سرزمین ہو، برصغیر کی اصلاحی تحریکیں ہوں یا روحانی سلاسل کی تاریخ، ہر جگہ وہی لوگ اصل بنیاد قرار پاتے ہیں جو ابتدا میں اخلاص، اطاعت اور بے نفسی کے ساتھ جڑتے ہیں۔

صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل نے فاؤنڈنگ ممبرز کی ذمہ داریوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ اعزاز صرف فخر کا نہیں بلکہ ایک بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ ہر فاؤنڈنگ ممبر اپنے علاقے میں ماہانہ بنیاد پر تنظیمی سرگرمیوں میں شریک ہو۔ اپنے تجربات اور یادداشتوں کو تحریری شکل میں محفوظ کرے تاکہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہوں۔ نئی نسل کے ساتھ رابطہ رکھے اور انہیں تحریک کے پیغام سے جوڑے۔ اپنی اولاد کو بھی اس مشن کا حصہ بنائے تاکہ روحانی وراثت منتقل ہو سکے۔ اختلافی معاملات سے دور رہتے ہوئے ایک سرپرست کا کردار ادا کرے اور مثبت یادیں، محبت اور اتحاد کی فضا قائم رکھے۔

فاؤنڈنگ ممبرز وہ خوش نصیب و فیض یافتہ لوگ ہیں جنہوں نے اس وقت اس قافلے کا ساتھ دیا جب یہ محض ایک تصوّر، امید اور پیغام تھا۔ اس عظیم مشن کے ساتھ تعلق کو ہمیشہ زندہ رکھا جائے، اس کی خدمت کو جاری رکھا جائے، اس نسبت کی حفاظت کی جائے اور اس امانت کو اگلی نسلوں تک منتقل کیا جائے تاکہ یہ قافلہ اخلاص، وفا، خدمت اور برکت کے ساتھ آگے بڑھتا رہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مشن کو قیامت تک جاری و ساری رکھے اور اس سے وابستہ افراد کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

☆ تقریب میں سینئر ممبرز محترم احمد نواز انجم، محترم سید گلزار شاہ، محترم پروفیسر سلیمان خان، محترم ڈاکٹر ظفر علی ناز قریشی، محترم قاضی زاہد حسین، محترم سید مظفر حسین شاہ محترم عبد الخالق چشتی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس خوبصورت اور باوقار تقریب میں ملک بھر سے بنفس نفیس اور آن لائن سیکڑوں فاؤنڈنگ ممبرز نے شرکت کی۔

فاؤنڈنگ ممبرز ڈے

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کے لیے "یونیسکو چیئر" کی تفویض
منہاجینز کے زیر اہتمام تقریبِ تحسین کا انعقاد

11 اپریل 2026ء مرکزی سیکرٹریٹ منہاج القرآن انٹرنیشنل، لاہور میں منہاجینز فورم کے زیر اہتمام منہاج القرآن انٹرنیشنل کے صدر اور منہاج یونیورسٹی لاہور کے ڈپٹی چیئرمین بورڈ آف گورنرز، پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کو یونیسکو (UNESCO) کی جانب سے "چیئر برائے تعلیم، امن اور بین الثقافتی مکالمہ" تفویض کیے جانے پر ایک پروقار "تقریبِ تحسین" منعقد کی گئی۔ منہاجینز فورم کے زیرِ اہتمام منعقدہ اس تقریب میں تحریک کے مرکزی قائدین، اساتذہ منہاج یونیورسٹی، اساتذہ کالج آف شریعہ، منہاجینز اور ہر طبقہ زندگی کی نمایاں شخصیات نے شرکت کی۔

☆ اس پروقار تقریب سے گفتگو کرتے ہوئے محترم خرم نواز گنڈاپور (ناظمِ اعلیٰ) نے کہا کہ پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کو یونیسکو چیئر برائے تعلیم، امن اور بین الثقافتی مکالمہ ملنا تحریک منہاج القرآن اور پاکستان کے لئے ایک تاریخی اعزاز ہے، یہ امر باعثِ فخر ہے کہ پاکستان میں سب سے پہلے جس ادارے کو اس عالمی چیئر کے قیام کے لئے منتخب کیا گیا وہ منہاج یونیورسٹی لاہور ہے، جو تحریک منہاج القرآن انٹرنیشنل کا ایک نمایاں تعلیمی ادارہ ہے۔ انہوں نے اس کامیابی کو تحریک کی چار دہائیوں پر محیط بین الاقوامی خدمات کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ تحریک منہاج القرآن نے ہمیشہ بین المذاہب و بین المسالک ہم آہنگی، رواداری اور مکالمے کو فروغ دیا۔ تحریک منہاج القرآن نے نہ

صرف بین المذاہب تعلقات کے فروغ کے لئے عملی اقدامات کیے بلکہ پاکستان میں بسنے والے تمام مذاہب کے افراد کے حقوق، احترام اور مساوات کے لیے بھی آواز بلند کی۔

☆ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے محترم پروفیسر ڈاکٹر ساجد محمود شہزاد (وائس چانسلر، MUL) نے کہا شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے چار دہائیاں قبل جس وژن کی بنیاد رکھی گئی تھی، آج وہ حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔ منہاج القرآن کے پلیٹ فارم سے قائم ہونے والے ادارے اس ویژن کی عملی تعبیر ہیں اور یہ اعزاز اسی تسلسل کی ایک نمایاں کڑی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری محض ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک ادارہ ہیں، جن کی قیادت میں رہنے والے افراد نہ صرف علمی رہنمائی حاصل کرتے ہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبہ جات میں سیکھنے کے بے شمار مواقع بھی پاتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری ایک ممتاز محقق، ماہرِ معاشیات اور سماجی سائنسدان ہیں، جن کی علمی مہارت زندگی کے مختلف پہلوؤں پر محیط ہے۔ ان کی تحقیق اور فکری کاوشیں نہ صرف تعلیمی میدان میں رہنمائی فراہم کرتی ہیں بلکہ معاشرتی بہتری اور پائیدار ترقی کے لئے بھی اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

☆ محترم پروفیسر ڈاکٹر خرم شہزاد (رجسٹرار، MUL) نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یونیسکو چیئرز اُن اداروں اور شخصیات کو دی جاتی ہیں جو علمی میدان میں نمایاں کارکردگی اور تحقیق کے فروغ میں منفرد مقام رکھتے ہوں، عالمی سطح پر امن کے فروغ کے لئے قائم یونیسکو چیئرز یورپ، امریکہ اور افریقہ سمیت مختلف خطوں میں سرگرم عمل ہیں اور اب منہاج یونیورسٹی لاہور کا اس عالمی نیٹ ورک میں شامل ہونا پاکستان کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے، کامیابی اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان علمی و تحقیقی میدان میں عالمی سطح پر اپنی شناخت مستحکم کر رہا ہے۔ گزشتہ ایک دہائی کے دوران پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کی قیادت میں منہاج یونیورسٹی لاہور میں متعدد ریسرچ و ٹریننگ سینٹرز قائم کیے گئے، جن میں پالیسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ، اسلامک اکنامکس اور دیگر عالمی معیار کے تحقیقی مراکز شامل ہیں۔ ان اداروں نے تحقیق، تربیت اور علمی مکالمے کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور یہی ماحول یونیسکو چیئر کے مقاصد کے حصول میں معاون ثابت ہوگا۔

☆ محترم حاجی امین قادری (چیئرمین ڈائریکٹوریٹ آف ریسورسز) نے اس تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کامیابی اس فکری جدوجہد کا تسلسل ہے جس کی بنیاد شیخ الاسلام نے رکھی۔ انہوں نے 1990ء کی دہائی میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنسز کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اپنی آنکھوں سے تحریک منہاج القرآن کے سفر کو ترقی کرتے دیکھا ہے۔ ابتداء ہی سے اس تحریک کا مقصد

بین المذاہب رواداری، بین المسالک ہم آہنگی اور امن کے فروغ کو یقینی بنانا ہے۔ تحریک کے پروگرامز میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو مدعو کرنا اور ان کے ساتھ مثبت مکالمہ کرنا اسی فکر کا عملی اظہار تھا، جس نے معاشرے میں برداشت اور احترام کی فضا قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ منہاج یونیورسٹی لاہور کا قیام بھی اسی وژن کا تسلسل ہے، جہاں علم کے ساتھ ساتھ کردار سازی اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیا جارہا ہے۔ آج کی یہ تقریب اس اعزاز کے اعتراف میں سجائی گئی ہے، جو نہ صرف ایک شخصیت بلکہ ایک نظریہ اور ایک تحریک کی عالمی سطح پر پذیرائی کا مظہر ہے۔

★ محترم محمد شاہد لطیف (صدر منہاجینز فورم) نے کہا کہ گزشتہ چند دہائیوں میں تحریک نے جس انداز سے عالمی سطح پر مقام حاصل کیا ہے، یہ اس کی مخلص قیادت، فکری گہرائی اور مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ یہ اعزاز در حقیقت پوری تحریک کے لئے باعثِ فخر ہے۔ تحریک منہاج القرآن کو اگر ایک ہیرے سے تشبیہ دی جائے تو یہ ہر زاویے سے اپنی الگ چمک رکھتی ہے اور ہر دیکھنے والا اپنی بصیرت اور ظرف کے مطابق اس کے اثرات محسوس کرتا ہے۔ عام قیادت اور تجدیدی قیادت میں واضح فرق ہوتا ہے۔ تجدیدی قیادت وہ ہوتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیض کی حامل ہو اور اس میں تین بنیادی اوصاف پائے جاتے ہیں: قابلیت، اہلیت اور طلب۔ خوش نصیبی سے تحریک منہاج القرآن کی قیادت ان تمام اوصاف کی حامل ہے۔ تحریک کی ترقی محض تنظیمی ڈھانچے یا ظاہری وسائل کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک گہری روحانی اور فکری قوت کارفرما ہے۔ تحریک کی کامیابی کا اصل راز قیادت کا دنیا سے بے نیاز ہونا اور اخلاص پر مبنی فکر ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس نے اس مشن کو عالمی سطح پر ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ جب قیادت کا دل دنیاوی مفادات سے آزاد ہو جائے تو پھر اس کی جدوجہد نسلوں کے ایمان اور کردار کی تشکیل کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

★ محترم پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے اس موقع پر اپنے خصوصی خطاب میں کہا آج کی تقریب محض ایک رسمی اجتماع نہیں بلکہ ایک طویل فکری، علمی اور تحریکی سفر کی یادگار روداد ہے، جس کے پیچھے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی گزشتہ چار دہائیوں پر محیط جدوجہد، بصیرت اور انقلابی سوچ کارفرما ہے، جب دنیا میں بین المسالک اور بین المذاہب ہم آہنگی کا تصور بھی مشکل تھا، اس وقت شیخ الاسلام نے اتحادِ امت، رواداری اور مکالمے کی بنیاد رکھ دی تھی۔ 1980ء کی دہائی میں جب فرقہ واریت اپنے عروج پر تھی، اس وقت مختلف مکاتبِ فکر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ایک خواب محسوس ہوتا تھا مگر تحریک منہاج القرآن نے اسے عملی شکل دی۔ بعد ازاں 1990ء کی دہائی میں بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لئے جو اقدامات کئے گئے، آج وہ عالمی سطح پر تسلیم شدہ ماڈل ہیں۔

منہاج القرآن کی جدوجہد محض نظریاتی نہیں بلکہ عملی اور ادارہ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس فکر کو آگے بڑھانے کے لیے مختلف ادارے قائم کئے گئے، جن میں منہاج ایجوکیشن سوسائٹی، نظام المدارس پاکستان اور بالخصوص منہاج یونیورسٹی لاہور شامل ہیں۔ منہاج یونیورسٹی لاہور صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک فکری، تحقیقی اور عالمی سطح پر اثرانداز ہونے والا مرکز ہے، یونیورسٹی میں قائم کئے گئے ریسرچ سینٹرز، جدید علوم، بین المذاہب مکالمہ، انسدادِ انتہا پسندی، مائیگریشن اسٹڈیز اور اسلامی بینکاری جیسے شعبہ جات اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ ادارہ وقت کے تقاضوں کے مطابق رہنمائی فراہم کر رہا ہے۔

منہاج القرآن انٹرنیشنل کی کامیابی کسی ایک شعبے تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک ہمہ جہت تحریک ہے، جو علم، تحقیق، امن، رواداری اور انسانیت کی خدمت کے ہر میدان میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ یونیسکو چیئر محض ایک اعزاز نہیں بلکہ ایک ذمہ داری ہے۔ یہ چیئر تحقیق، پالیسی سازی، بین الاقوامی مکالمہ اور امن کے فروغ کے لئے ایک فعال پلیٹ فارم کے طور پر کام کرے گی، جس کے ذریعے عالمی سطح پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے، اس چیئر کے تحت نہ صرف علمی و تحقیقی کام ہوگا بلکہ کمیونٹی انگیجمنٹ کے ذریعے معاشرتی سطح پر بھی تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے گی اور یہ سب کچھ منہاج القرآن کی فکر کے تحت انجام پائے گا۔

☆ تقریب میں نظامت کے فرائض محترم عین الحق بغدادی نے سرانجام دیے۔ تقریب کے اختتام پر اس تاریخی کامیابی کی خوشی میں کیک کاٹا گیا۔ شرکاء نے ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کو مبارکباد پیش کی اور ان کی علمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

فریدِ ملت ڈاکٹر فریدالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ کا 53 واں سالانہ عرس مبارک

رپورٹ: حافظ عبدالقدیر قادری

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے والدِ گرامی حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فریدالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ کا 53 واں سالانہ عرس مبارک نہایت عقیدت واحترام اور مذہبی جوش وجذبے کے ساتھ بستی لوہلے شاہ، جھنگ صدر میں منعقد ہوا۔ اس روحانی تقریب میں ملک بھر سے علماء ومشائخ، قراء ونعت خوان اور عقیدت مندوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ عرس مبارک کی تقریبات کا باقاعدہ آغاز دربارِ عالیہ پر چادر پوشی کی روح پرور تقریب سے ہوا۔ ایڈمنسٹریٹر دربارِ فریدالحاج صبغت اللہ قادری، صاحبزادہ محمد طاہر قادری، حافظ عبدالقدیر قادری، نائب ناظمِ اعلیٰ منہاج القرآن جواد حامد، بریگیڈیئر (ر) عمر حیات، جی ایم ملک، رانا محمد ادریس قادری، نور اللہ صدیقی اور دیگر مرکزی قائدین نے مزارِ اقدس پر چادر پوشی کی اور پھولوں کی چادریں چڑھائیں۔

مرکزی تقریب میں قراء کرام نے تلاوت قرآن اور ثناخوانان نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ عالمی شہرت یافتہ نقیب صفدر علی محسن، صاحبزادہ تسلیم احمد صابری اور علامہ منہاج الدین قادری نے نقابت کے فرائض سرانجام دیے۔

☆ عرس مبارک کی اس تقریب میں صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے "فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ: علم، روحانیت اور خدمتِ خلق کا حسین امتزاج" کے موضوع پر خصوصی خطاب فرمایا۔ ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے اپنے خطاب میں کہا کہ حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ بیسویں صدی کی اُن نابغہ روزگار شخصیات میں سے تھے جن کی ذات میں علم وحکمت، تصوف وروحانیت، ادب وشاعری، جدید وقدیم طب، فہم وفراست اور

اخلاص و کردار ایک حسین اور متوازن امتزاج کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ آپ محض ایک عالم یا معالج نہ تھے بلکہ ایک ایسے مربی، مرشد اور صاحبِ نظر انسان تھے جنہوں نے اپنے عہد میں علم، روحانیت اور کردار سازی کے میدان میں گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے۔

کسی بھی شخصیت کی اصل قدر و منزلت کا اندازہ اس کے علم، فکر، کردار اور اس علمی و روحانی ورثے سے ہوتا ہے جو وہ اپنے بعد چھوڑ جاتی ہے۔ حضرت فریدِ ملت قادریؒ اس اعتبار سے ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی ذہانت، وسعتِ مطالعہ اور فکری جامعیت سے نوازا تھا۔ آپ نے دینی اور عصری علوم کے درمیان ایسا حسین ربط قائم کیا جو اپنے عہد میں بہت کم شخصیات کو نصیب ہوا۔ آپ کی ذات اس حقیقت کی روشن مثال بن گئی کہ دین اور دنیا کا متوازن امتزاج ہی امت کی درست رہنمائی کا ذریعہ بنتا ہے۔

حضرت فریدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کا علمی ذوق اور تصنیفی سرمایہ، بالخصوص ان کا سفر نامہ، اپنی مثال آپ ہے۔ یہ سفر نامہ محض سفری مشاہدات کا بیان نہیں بلکہ ایک صاحبِ بصیرت، صاحبِ دل اور عارفانہ نگاہ رکھنے والے عالم کی نظر سے دیکھی گئی دنیا کی ایسی تصویر ہے جس میں تاریخ، ادب، روحانیت اور دینی شعور ایک دوسرے میں گھلے ملے دکھائی دیتے ہیں۔ ایران، عراق، ترکی اور شام کے سفر پر مبنی یہ تحریر اپنے اندر ایسی علمی و روحانی گہرائی رکھتی ہے کہ اسے صرف ایک سفر نامہ کہنا اس کے مقام کو محدود کرنا ہوگا۔ آپ جہاں بھی گئے، وہاں صرف مقامات کی ظاہری کیفیت بیان نہیں کی بلکہ ان کے تاریخی پس منظر، علمی اہمیت، روحانی تاثیر اور باطنی اسرار کو بھی نہایت دل نشیں انداز میں قلم بند کیا۔ اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری، روحانی مشاہدات کا بیان، قرآن و حدیث کے حوالے، عربی و فارسی ادب سے استشہاد، اور تہذیب و معاشرت پر باریک نظر، یہ سب عناصر مل کر آپ کے سفر نامے کو ایک منفرد علمی و ادبی شاہکار بنا دیتے ہیں۔ بطور معالج آپ کی تجزیاتی نگاہ نے اس سفر نامے کو ایک خاص فکری اور مشاہداتی جہت بھی عطا کی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ دنیا کو محض ایک مادی منظر نامہ نہیں بلکہ آیاتِ الٰہی کے ظہور کے طور پر دیکھتے تھے۔

حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ کے سفر نامے کا اسلوب ایسا ہے کہ وہ تاریخ کے اوراق کے درمیان سے قاری کو گزار کر قرآن و حدیث کے حوالوں سے روشنی فراہم کرتے ہیں، پھر ادب، شاعری اور روحانیت کے ذریعے ایک مکمل فکری و روحانی فضا قائم کر دیتے ہیں۔ حضرت فریدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ نے محدود مدت میں چار ممالک کا سفر کیا، مگر اپنے مشاہدات، علمی گہرائی اور روحانی بصیرت کے ذریعے اسے ایک لازوال علمی و ادبی سرمایہ بنا دیا۔ آپ کا علم سے تعلق محض

تدریس یا تصنیف تک محدود نہ تھا بلکہ آپ نایاب کتب کے شائق، وسیع المطالعہ عالم اور اعلیٰ علمی ذوق رکھنے والے محقق تھے۔ آپ کا ذاتی کتب خانہ، جو آج بھی فریدِ ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں علمی سرمایے کے طور پر محفوظ ہے، آپ کی علمی وسعت اور کتاب دوستی کا زندہ ثبوت ہے۔ آپ کی شخصیت ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک مستقل جہانِ علم و معرفت کی حیثیت رکھتی تھی۔

حضرت فریدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی اور روشن میراث ان کی تربیتی عظمت ہے۔ تاریخ میں عظیم شخصیات صرف اپنی ذات کے باعث عظیم نہیں ہوتیں بلکہ وہ آئندہ نسلوں کی فکری و روحانی تشکیل بھی کرتی ہیں۔ آپ کی زندگی کا ایک نمایاں ترین پہلو یہ ہے کہ آپ نے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی صورت میں ایک ایسی عظیم شخصیت کی تربیت فرمائی جس نے عالمی سطح پر دینِ اسلام کی ترویج و اشاعت، تجدید و احیائے دین، اُمت کی فکری رہنمائی اور روحانی بیداری کا عظیم کام انجام دیا۔ اس اعتبار سے آپ کی حیاتِ طیبہ محض ایک فرد کی زندگی نہیں بلکہ ایک پورے فکری و روحانی سلسلے کی بنیاد ہے۔

آپ کی حیات ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اخلاص، علم، محبتِ رسول ﷺ، حلال رزق، سادگی، کردار، ایثار اور نسلوں کی دینی تربیت ہی وہ اقدار ہیں جن سے عظیم معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ آج اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی نئی نسلوں کے عقائد، کردار اور دینی شعور کی حفاظت کریں، انہیں صالح ماحول فراہم کریں اور ایسی تربیت کا اہتمام کریں جو انہیں دین، علم اور اخلاق کے ساتھ مضبوطی سے جوڑے رکھے۔ اللہ رب العزت ہمیں حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و روحانی فیوض سے بہرہ مند فرمائے، ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے اور ہماری نسلوں کو علم، عمل، اخلاص اور محبتِ رسول ﷺ کی دولت سے مالا مال فرمائے۔

عرس مبارک کی اس روح پرور تقریب کا اختتام حضرت فریدِ ملتؒ کے درجات کی بلندی، امتِ مسلمہ کے اتحاد، ملکِ پاکستان کی سلامتی اور خوشحالی کی خصوصی دعاؤں کے ساتھ ہوا۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر
دارالعلوم فریدیہ قادریہ و تحریک

اللھم صل علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و صحبہ و بارک وسلم
16 شوال
مبارک
فرید ملت
رحمۃ اللہ علیہ
ڈاکٹر فرید الدین قادری
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
مدظلہ العالی
تحریک پاکستان کی جدوجہد میں نمایاں خدمات
تحریک منہاج القرآن جھنگ

منہاج القرآن انٹرنیشنل کے نائب صدر
بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اقبال احمد خان کا انتقال پر ملال

گزشتہ ماہ منہاج القرآن انٹرنیشنل کے نائب صدر بریگیڈیئر (ر) اقبال احمد خان انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری، محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، محترم ڈاکٹر حسین محی الدین قادری، ناظم اعلیٰ خرم نواز گنڈاپور اور منہاج القرآن انٹرنیشنل کی جملہ مرکزی قیادت نے بریگیڈیئر (ر) اقبال احمد خان کے انتقال پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم ایک نہایت مخلص، محنتی اور ذمہ دار شخصیت تھے، جنہوں نے تحریک منہاج القرآن کے استحکام اور فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی خدمات اور وابستگی کو ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ مرحوم اخلاص وفا کا پیکر، دیانتدار، ایماندار، انتہائی خوش اخلاق، خوش گفتار اور مصطفوی مشن کا عظیم سرمایہ تھے۔ تحریک منہاج القرآن کے لیے اُن کی 25 سالہ غیر معمولی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اللہ رب العزت ان کی بخشش و مغفرت فرمائے اور اُن کے جملہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور اُن کی اولاد کو دینِ مبین کی راہ پر استقامت عطا کرے۔ آمین

مرحوم کی نماز جنازہ صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے پڑھائی۔ نماز جنازہ میں جملہ مرکزی قائدین، سٹاف اور کثیر تحریکی کارکنان نے شرکت کی اور ان کی بخشش و مغفرت کے لئے دعا کی اور مرحوم کے پسماندگان بالخصوص راجہ فیض رسول (بیٹے)، سمیع الرحمن اور شجاع الرحمن (نواسے) و دیگر لواحقین سے اظہار تعزیت کیا۔

اللہ تعالیٰ بریگیڈیئر (ر) اقبال احمد خان کی مغفرت فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل و اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ
کے عرس مبارک کے موقع پر تقریب

منہاجینز فورم کے زیر اہتمام
ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کے اعزاز میں تقریب تحسین

Monthly
MINHAJ-UL-QURAN LAHORE
May-2026
Regd CPL No.41

علمی و عملی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی و سائنسی، فقہی و قانونی، انقلابی اور فکری و عصری موضوعات پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی 650 سے زائد کتب دستیاب ہیں